بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

6973

سورۃ المطففین (83)

آیت نمبر (1 تا 17)

ط ف ف

(ض) طَفًّا ہاتھ یا پاؤں سے کسی چیز کو اٹھانا۔

(تفعیل) تَطۡفِیۡفًا کسی چیز میں ذرا سی کمی کرنا۔ پیمانہ کو تھوڑا سا کم بھرنا۔ زیر مطالعہ آیت۔1۔

ر ی ن

(ض) رَیۡنًا کسی کا کسی پر غالب آنا۔ چھا جانا۔ زیر مطالعہ آیت۔14۔

ترجمہ

وَیۡلٌ لِّلۡمُطَفِّفِیۡنَ ۙ﴿۱﴾	الَّذِیۡنَ اِذَا اکۡتَالُوۡا عَلَی النَّاسِ	یَسۡتَوۡفُوۡنَ ۖ﴿۲﴾
تباہی ہے کمی کرنے والوں کے لیے	وہ لوگ جو جب کبھی ناپ کر لیتے ہیں لوگوں سے	تو پورا لینا چاہتے ہیں

وَاِذَا کَالُوۡهُمۡ	اَوۡ وَّزَنُوۡهُمۡ	یُخۡسِرُوۡنَ ؕ﴿۳﴾	اَلَا یَظُنُّ اُولٰٓئِکَ
اور جب کبھی ناپ کر دیتے ہیں ان کو	یا تول کر دیتے ہیں ان کو	تو کمی کرتے ہیں	کیا گمان نہیں کرتے وہ لوگ

اَنَّهُمۡ مَّبۡعُوۡثُوۡنَ ۙ﴿۴﴾	لِیَوۡمٍ عَظِیۡمٍ ۙ﴿۵﴾	یَّوۡمَ یَقُوۡمُ النَّاسُ	لِرَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ؕ﴿۶﴾
کہ وہ اٹھائے جانے والے ہیں	ایک عظیم دن کے لیے	جس دن کھڑے ہوں گے لوگ	تمام جہانوں کے رب کے سامنے

کَلَّاۤ اِنَّ کِتٰبَ الۡفُجَّارِ	لَفِیۡ سِجِّیۡنٍ ؕ﴿۷﴾	وَمَاۤ اَدۡرٰىکَ مَا سِجِّیۡنٌ ؕ﴿۸﴾
ہرگز نہیں! بیشک نافرمانی کرنے والوں کی کتاب (نامہ اعمال)	یقیناً سجین میں ہے	اور تو کیا جانے کیا ہے سجین

کِتٰبٌ مَّرۡقُوۡمٌ ؕ﴿۹﴾	وَیۡلٌ یَّوۡمَئِذٍ	لِّلۡمُکَذِّبِیۡنَ ۙ﴿۱۰﴾	الَّذِیۡنَ یُکَذِّبُوۡنَ
(وہ) ایک لکھی ہوئی کتاب ہے	تباہی ہے اس دن	جھٹلانے والوں کے لیے	وہ لوگ جو جھٹلاتے ہیں

بِیَوۡمِ الدِّیۡنِ ؕ﴿۱۱﴾	وَمَا یُکَذِّبُ بِهٖۤ	اِلَّا کُلُّ مُعۡتَدٍ اَثِیۡمٍ ۙ﴿۱۲﴾
بدلے کے دن کو	اور نہیں جھٹلاتے اس کو	مگر سارے حد سے بڑھنے والے گنہگار

اِذَا تُتۡلٰی عَلَیۡهِ اٰیٰتُنَا	قَالَ اَسَاطِیۡرُ الۡاَوَّلِیۡنَ ؕ﴿۱۳﴾	بَلۡ ۜ رَانَ عَلٰی قُلُوۡبِهِمۡ
جب کبھی پڑھ کر سنائی جاتی ہے اس کو ہماری آیتیں	تو وہ کہتا ہے پہلے لوگوں کے افسانے ہیں	ہرگز نہیں! بلکہ چھا گیا ان کے دلوں پر

مَّا کَانُوۡا یَکۡسِبُوۡنَ ﴿۱۴﴾	کَلَّاۤ اِنَّهُمۡ عَنۡ رَّبِّهِمۡ	یَوۡمَئِذٍ لَّمَحۡجُوۡبُوۡنَ ؕ﴿۱۵﴾
وہ جو یہ لوگ کماتے تھے	ہرگز نہیں! بیشک یہ لوگ اپنے رب سے	اس دن یقیناً روکے ہوئے ہوں گے

ثُمَّ اِنَّهُمْ	لَصَالُوا الْجَحِيْمِ ﴿۶۳﴾	ثُمَّ يُقَالُ	هٰذَا الَّذِيْ	كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴿۶۴﴾
پھر بیشک یہ لوگ	یقیناً گرنے والے ہیں جہنم میں	پھر ان سے کہا جائے گا	یہ وہ ہے	تم لوگ جس کو جھٹلایا کرتے تھے

نوٹ:1

اس سورت کے انداز بیان اور مضامین سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ مکہ کے ابتدائی دور میں نازل ہوئی ہے جب اہل مکہ کے ذہن میں آخرت کا عقیدہ بٹھانے کے لیے پے در پے سورتیں نازل ہو رہی تھیں۔ بعض مفسرین نے اس کو مدنی قرار دیا ہے۔ اس غلط فہمی کی وجہ دراصل ابن عباسؓ کی یہ روایت ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینے تشریف لائے تو یہاں کے لوگوں میں کم ناپنے اور تولنے کا مرض پھیلا ہوا تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ سورہ نازل کی اور لوگ بہت اچھی طرح ناپنے تولنے لگے۔ لیکن جیسا کہ اس سے پہلے ہم بیان کر چکے ہیں کہ صحابہ کرامؓ اور تابعین کا یہ عام طریقہ تھا کہ ایک آیت جس معاملہ میں چسپاں ہوتی ہو اس کے متعلق وہ یوں کہا کرتے تھے کہ یہ فلاں معاملہ میں نازل ہوئی۔ اس لیے ابن عباسؓ کی روایت سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ جب ہجرت کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے لوگوں میں یہ بری عادت پھیلی ہوئی پائی تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سورت ان کو سنائی اور اس سے ان کے معاملات درست ہو گئے۔ (تفہیم القرآن۔ ج۶، ص ۸۷۲)

نوٹ:2

مُطَفِّفِيْن کا لفظ تَطْفِيْف سے مشتق ہے۔ عربی میں طَفِيْف چھوٹی اور حقیر چیز کے لیے بولتے ہیں اور تطفیف کا لفظ اصطلاحاً ناپ تول میں چوری چھپے کمی کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ کام کرنے والا ناپ کر یا تول کر چیز دیتے ہوئے کوئی بڑی مقدار نہیں اڑاتا بلکہ ہاتھ کی صفائی دکھا کر ہر خریدار کے حصے سے تھوڑا تھوڑا اڑاتا رہتا ہے۔ (تفہیم القرآن)۔

قرآن وحدیث میں ناپ تول میں کمی کرنے کو حرام قرار دیا ہے۔ کیونہ عام طور پر معاملات کا لین دین انہی دو طریقوں سے ہوتا ہے اور انہی کے ذریعہ کہا جا سکتا ہے کہ حقدار کا حق ادا ہوا یا نہیں۔ لیکن اس سے مقصود ہر ایک حقدار کا حق پورا پورا دینا ہے اور اس میں کمی کرنا حرام ہے۔ تو معلوم ہوا کہ یہ صرف ناپ تول کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ ہر وہ چیز جس سے حق پورا کرنا یا نہ کرنا جانچا جاتا ہے، اس کا یہی حکم ہے۔ حضرت عمرؓ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ نماز کے رکوع سجدے وغیرہ پورے نہیں کرتا بلکہ جلدی جلدی نماز ختم کر ڈالتا ہے۔ تو اس سے فرمایا کہ تو نے اللہ کے حق میں تطفیف کر دی۔ حضرت عمرؓ کے اس قول کو نقل کر کے امام مالکؒ نے فرمایا کہ حق پورا دینا یا کم کرنا ہر چیز میں ہے، یہاں تک کہ نماز، وضو، طہارت وغیرہ میں بھی اور اسی طرح دوسرے حقوق اللہ اور عبادات میں کمی کوتاہی کرنے والا تطفیف کرنے کا مجرم ہے۔ اسی طرح حقوق العباد میں جو شخص مقررہ حق سے کم کرتا ہے وہ بھی تطفیف کے حکم میں ہے۔ ملازم نے جتنے وقت کی خدمت کا معاہدہ کیا ہے اس میں سے وقت چرانا اور چوری کرنا بھی اس میں داخل ہے۔ وقت کے اندر جس طرح محنت کرنے کا عرف میں معمول ہے اس میں سستی کرنا بھی تطفیف ہے۔ اپنی ملازمت کے فرائض میں کمی کرنے کو کوئی گناہ بھی نہیں سمجھتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب قوم تطفیف کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ ان کا رزق قطع کر دیتا ہے۔ حدیث میں جو رزق قطع کر دینے کا ارشاد ہے اس کی یہ صورت بھی ہو سکتی ہے کہ اس کو رزق سے بالکل محروم کر دیا جائے۔ اور یہ صورت بھی قطع رزق میں داخل ہے کہ رزق موجود ہوتے ہوئے وہ اس کو کھا نہ سکے یا استعمال نہ کر سکے جیسے بہت سے بیماریوں میں اس کا مشاہدہ ہوتا ہے اور اس زمانے میں بہت عام ہے۔ اسی طرح قحط کی یہ صورت بھی ہو سکتی ہے کہ اشیاء ضرورت مفقود ہو جائیں اور یہ بھی ہو سکتی ہے کہ موجود ہونے کے باوجود ان کی گرانی اتنی بڑھ جائے کہ خریداری مشکل ہو جائے۔ جیسا کہ آج کل اس کا مشاہدہ اکثر چیزوں میں ہو رہا ہے۔ اس سے وہ شبہات رفع ہو جاتے ہیں جو حدیث کے الفاظ کے متعلق ظاہر حالات کے اعتبار سے ہو سکتے ہیں۔ (معارف القرآن)۔

نوٹ:3 معاشرے کی بے شمار خرابیوں میں سے ایک خرابی کو بطور مثال لے کر یہ بتایا گیا ہے کہ یہ آخرت سے غفلت کا لازمی نتیجہ ہے۔ جب تک لوگوں کو یہ احساس نہ ہو کہ خدا کے سامنے پیش ہونا ہے اور کوڑی کوڑی کا حساب دینا ہے، اس وقت تک یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنے معاملات میں کامل راستبازی اختیار کر سکیں۔ کوئی شخص دیانتداری کو اچھی پالیسی سمجھ کر بعض چھوٹے معاملات میں دیانت برت بھی لے، تو ایسے مواقع پر وہ کبھی دیانت نہیں برت سکتا جہاں بے ایمانی ایک مفید پالیسی ثابت ہوتی ہو۔ آدمی کے اندر سچی اور مستقل دیانتداری اگر پیدا ہو سکتی ہے تو صرف آخرت پر یقین ہی سے ہو سکتی ہے، کیونکہ اس صورت میں دیانت ایک ''پالیسی'' نہیں بلکہ ''فریضہ'' قرار پاتی ہے اور آدمی کے اس پر قائم رہنے یا نہ رہنے کا انحصار دنیا میں مفید ہونے یا غیر مفید ہونے پر نہیں رہتا۔ (تفہیم القرآن۔ ج۶۔ ص ۸۷۲۔ ۹۷۲)

نوٹ:4 آیت۔ 7۔ میں لفظ سِجِّیْنٍ آیا ہے جو سجن سے مشتق ہے جس کے معنی تنگ جگہ میں قید کرنے کے ہیں۔ اور احادیث و آثار سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سجین ایک خاص مقام کا نام ہے اور کفار و فجار کی ارواح کا مقام یہی ہے اور اسی مقام پر ان کے نامۂ اعمال رہتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کے اعمال نامہ اس جگہ محفوظ کر دیئے جاتے ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس جگہ کوئی ایسی جامع کتاب ہو جس میں تمام کفار و فجار کے اعمال لکھ دیئے جاتے ہوں۔ اس کے آگے کِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ کے الفاظ آئے ہیں ان کے متعلق امام بغوی اور ابن کثیر نے فرمایا کہ یہ جملہ مقام سجین کی تفسیر نہیں ہے بلکہ اس سے پہلے جو کِتٰبَ الفجار آیا ہے اس کا بیان ہے۔ (معارف القرآن)۔

نوٹ:5 آیت۔ 14۔ میں رَانَ کا لفظ رین سے مشتق ہے جس کے معنی زنگ اور میل کچیل کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے دلوں پر ان کے گناہوں کا زنگ لگ گیا ہے اور جس طرح زنگ لوہے کو کھا کر مٹی بنا دیتا ہے اسی طرح ان کے گناہوں کے زنگ نے ان کے دل کی اس صلاحیت کو ختم کر دیا جس سے بھلے برے کی تمیز ہوتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ بندہ جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ لگ جاتا ہے۔ اگر اس نے توبہ کر لی تو یہ سیاہ نقطہ مٹ جاتا ہے اور دل اپنی اصل حالت میں منور ہو جاتا ہے۔ اور اگر اس نے توبہ نہ کی بلکہ اپنے گناہوں میں زیادتی کرتا چلا گیا تو یہ سیاہی اس کے سارے قلب پر چھا جاتی ہے۔ (معارف القرآن)۔

آیت نمبر (18 تا 36)

ترجمہ

كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ	لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ ﴿١٨﴾	وَمَآ اَدْرٰىكَ
ہرگز نہیں! بیشک نیکی کرنے والوں کی کتاب (اعمال نامہ)	یقیناً بلندیوں میں ہے	اور تو کیا جانے

مَا عِلِّيُّوْنَ ﴿١٩﴾	كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ﴿٢٠﴾	يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ ﴿٢١﴾
کیا ہیں (وہ) بلندیاں	(وہ) ایک لکھی ہوئی کتاب ہے	موجود ہوتے ہیں اس پر قربت دیئے ہوئے (فرشتے)

اِنَّ الْاَبْرَارَ	لَفِيْ نَعِيْمٍ ﴿٢٢﴾	عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ ﴿٢٣﴾	تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ
بیشک نیکی کرنے والے	یقیناً دائمی خوشحالی میں ہوں گے	تختوں پر (بیٹھے) دیکھتے ہوئے	تو پہچانے گا ان کے چہروں میں

نَضْرَةَ النَّعِيْمِ ﴿٢٤﴾	يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ ﴿٢٥﴾	خِتٰمُهٗ مِسْكٌ	وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ
دائمی خوشحالی کی تروتازگی کو	وہ پلائے جائیں گے سربمہر کی ہوئی خالص (شراب)	جس کی مہر مشک ہوگی	اور اس میں پس چاہیے کہ جان کھپائیں

الْمُتَنَافِسُوْنَ ﴿۲۶﴾	وَمِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍ ﴿۲۷﴾	عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ ﴿۲۸﴾
جان کھپانے والے	اور اس (رحیق) کی ملاوٹ تسنیم سے ہوگی	(یعنی) ایک ایسا چشمہ ہے پئیں گے جس سے قربت دیئے ہوئے

اِنَّ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا	كَانُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَضْحَكُوْنَ ﴿۲۹﴾	وَاِذَا مَرُّوْا بِهِمْ
بیشک وہ لوگ جنہوں نے جُرم کیا	وہ ان سے جو ایمان لائے ہنسی ٹھٹھا کرتے تھے	اور جب گزرتے ان کے پاس سے

يَتَغَامَزُوْنَ ﴿۳۰﴾	وَاِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمُ	انْقَلَبُوْا فَكِهِيْنَ ﴿۳۱﴾
تو باہم ایک دوسرے کو آنکھ مارتے	اور جب لوٹتے ہیں اپنے گھر والوں کی طرف	تو لوٹتے ہیں اکڑ باز ہوتے ہوئے

وَاِذَا رَاَوْهُمْ	قَالُوْٓا اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَضَآلُّوْنَ ﴿۳۲﴾
اور جب وہ (مجرم) لوگ دیکھتے ہیں ان (اہل ایمان) کو	تو کہتے ہیں بیشک یہ لوگ یقیناً بھٹکنے والے ہیں

وَمَآ اُرْسِلُوْا عَلَيْهِمْ	حٰفِظِيْنَ ﴿۳۳﴾
حالانکہ وہ (مجرم) لوگ نہیں بھیجے گئے ان (اہل ایمان) پر	نگہبانی کرنے والے ہوتے ہوئے

فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	مِنَ الْكُفَّارِ	يَضْحَكُوْنَ ﴿۳۴﴾
تو آج کے دن وہ لوگ جو ایمان لائے	انکار کرنے والوں سے	ٹھٹھا کریں گے

عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ ﴿۳۵﴾	هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ	مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۳۶﴾
تختوں پر (بیٹھے) دیکھتے ہوئے	(تو) کیا بدلہ دے دیا گیا منکروں کو	وہ (اس کا) جو وہ کرتے تھے

نوٹ: 1

تنافس کے معنی ہے کہ چند آدمیوں کا کسی خاص مرغوب ومحبوب چیز کو حاصل کرنے کے لیے جھپٹنا اور دوڑنا تاکہ دوسروں سے پہلے وہ اس کو حاصل کرلیں۔ یہاں جنت کی نعمتوں کا ذکر فرمانے کے بعد حق تعالیٰ نے غفلت شعار انسان کو اس طرف متوجہ کیا ہے کہ آج تم لوگ جن چیزوں کو مرغوب ومطلوب سمجھ کر ان کو حاصل کرنے میں دوسروں سے آگے بڑھنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہو، وہ ناقص اور فانی نعمتیں اس قابل نہیں کہ ان کو مقصود زندگی سمجھ کر ان کے لیے مسابقت کرو۔ بلکہ ان میں تو قناعت وایثار سے کام لے کر یہ سمجھ لو یہ چند روزہ راحت کا سامان ہاتھ سے نکل بھی گیا تو کچھ بڑے صدمے کی بات نہیں، یہ ایسا خسارہ نہیں جس کی تلافی نہ ہو سکے۔ البتہ تنافس اور مسابقت کرنے کی چیز یہ جنت کی نعمتیں ہیں جو ہر حیثیت سے مکمل بھی ہیں اور دائمی بھی۔ (معارف القرآن)۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

6973

سورۃ الانشقاق (84)

آیت نمبر (1 تا 9)

ك	د	ح

(ف) كَدْحًا کسی کام میں بہت محنت کرنا۔ کسی چیز کے لیے تگ ودو کرنا۔
كَادِحٌ اسم الفاعل ہے۔ تگ ودو کرنے والا۔ زیر مطالعہ آیت۔6۔

ترجمہ

اِذَا السَّمَآءُ انۡشَقَّتۡ ۙ﴿۱﴾	وَ اَذِنَتۡ لِرَبِّهَا
جب آسمان پھٹ جائے گا	اور وہ کان دھرے گا اپنے رب (کے حکم) کے لیے

وَ حُقَّتۡ ۙ﴿۲﴾	وَ اِذَا الۡاَرۡضُ مُدَّتۡ ۙ﴿۳﴾	وَ اَلۡقَتۡ مَا فِیۡهَا
اس ہال میں کہ وہ اس لائق کیا گیا	اور جب زمین دراز کی جائے گی	اور وہ ڈال دے گی وہ جو اس میں ہے

وَ تَخَلَّتۡ ۙ﴿۴﴾	وَ اَذِنَتۡ لِرَبِّهَا	وَ حُقَّتۡ ۵﴾
اور خود خالی ہو جائے گی	اور وہ کان دھرے گی اپنے رب (کے حکم) کے لیے	اس حال میں کہ وہ اس لائق کی گئی

یٰۤاَیُّهَا الۡاِنۡسَانُ	اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰی رَبِّكَ	كَدۡحًا
اے انسان	یقیناً تو تگ ودو کرنے والا ہے اپنے رب کی طرف	جیسا تگ ودو کرنے کا حق ہے

فَمُلٰقِیۡهِ ۚ﴿۶﴾	فَاَمَّا مَنۡ	اُوۡتِیَ كِتٰبَهٗ	بِیَمِیۡنِهٖ ۙ﴿۷﴾
پھر ملاقات کرنے والا ہے اس سے	پس وہ جو ہے جس کو	دی گئی اس کی کتاب	اس کے داہنے ہاتھ میں

فَسَوۡفَ یُحَاسَبُ	حِسَابًا یَّسِیۡرًا ۙ﴿۸﴾	وَّ یَنۡقَلِبُ اِلٰۤی اَهۡلِهٖ	مَسۡرُوۡرًا ؕ﴿۹﴾
تو جلد ہی اس سے حساب لیا جائے گا	ایک ہلکا سا حساب	اور وہ لوٹے گا اپنے گھر والوں کی طرف	خوش کیا ہوا ہوتے ہوئے

نوٹ: 1

زمین کے پھیلا دیئے جانے کا مطلب یہ ہے کہ سمندر اور دریا پاٹ دیئے جائیں گے، پہاڑ ریزہ ریزہ کر کے بکھیر دیئے جائیں گے اور زمین کی ساری اونچ نیچ برابر کر کے اسے ایک ہموار میدان بنا دیا جائے گا۔ سورہ طٰہٰ میں اس کیفیت کو یوں بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے ایک چٹیل میدان بنا دے اجس میں تم کوئی بل اور سلوٹ نہ پاؤ گے۔ (آیات۔106۔107)۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ زمین ایک دستر خوان کی طرح پھیلا کر بچھا دی جائے گی۔ پھر انسان کے لیے اس پر صرف قدم رکھنے کی جگہ ہوگی۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے یہ حقیقت نگاہ میں رہنی چاہیے کہ اس دن تمام انسانوں کو جو روز آفرینش سے قیامت تک پیدا ہوئے ہوں گے، بیک وقت زندہ کر کے عدالت الٰہی میں پیش کیا جائے گا۔ اتنی بڑی آبادی کو جمع کرنے کے لیے ناگزیر ہے کہ سمندر، دریا، پہاڑ، جنگل، گھاٹیاں اور پست و بلند علاقے سب کے سب ہموار کر کے کرۂ زمین کو ایک میدان بنا دیا جائے تا کہ اس پر ساری نوع انسانی کے افراد کھڑے ہونے کی جگہ پا سکیں۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ:2

كَدْحٌ کے معنے کسی کام میں پوری جدوجہد اور اپنی توانائی صرف کرنے کے ہیں اور اِلٰی رَبِّكَ سے مراد اِلٰی لِقَاءِ رَبِّكَ ہے یعنی انسان کی ہر سعی اور جدوجہد کی انتہا اس کے رب کی ملاقات کی طرف ہونے والی ہے۔ اس آیت میں حق تعالیٰ نے بنی نوع انسان کو خطاب فرما کر اسے غور و فکر کے لیے ایک ایسی راہ دکھائی ہے کہ جس میں کچھ بھی عقل و شعور ہو تو وہ اپنی جدوجہد کا رخ صحیح سمت کی طرف پھیر سکتا ہے جو اس کو دنیا اور دین، دونوں میں سلامتی اور عافیت کی ضمانت دے۔

پہلی بات یہ ارشاد فرمائی کہ انسان نیک ہو یا بد، مومن ہو یا کافر، وہ اپنی فطرت سے اس کا عادی ہے کہ کسی نہ کسی چیز کو اپنا مقصود بنا کر اس کو حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کرے اور مشقت برداشت کرے۔ ایک نیک انسان اپنی ضروریات زندگی کی تحصیل میں جائز طریقوں کو اختیار کرتا ہے اور ان میں اپنی محنت و توانائی صرف کرتا ہے۔ ایک بدکار انسان بھی اپنے مقاصد کسی محنت اور جدوجہد کے بغیر حاصل نہیں کر سکتا۔ چور، ڈاکو اور دھوکہ فریب سے لوٹ کھسوٹ کرنے والوں کو دیکھو کسی کیسی ذہنی اور جسمانی مشقت برداشت کرتے ہیں جب ان کو ان کا مقصود حاصل ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ ارشاد فرمائی کہ انسان اگر غور کرے تو آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ اس کی حرکات ہوں یا سکنات، وہ سب ایک سفر کی منزلیں ہیں جسے وہ غیر شعوری طور پر طے کر رہا ہے۔ اس سفر کی انتہا موت ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضری۔ اور یہ انتہا ایسی حقیقت ہے کہ جس کا کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ انسان کی ہر جدوجہد کا موت پر ختم ہونا یقینی ہے۔ تیسری بات یہ بتلائی کہ موت کے بعد اپنے رب کے سامنے حاضری کے وقت تمام حرکات و اعمال اور جدوجہد کا حساب ہونا از روئے عقل و انصاف ضروری ہے تاکہ نیک و بد کا انجام الگ الگ معلوم ہو سکے کیونکہ دنیا میں اس کا کوئی امتیاز نہیں ہوتا۔ ایک نیک آدمی پورا مہینہ محنت مزدوری کر کے اپنا رزق اور جو ضروریات حاصل کرتا ہے، چور ڈاکو اس کو ایک رات میں حاصل کر لیتے ہیں۔ اگر کوئی حساب اور جزا و سزا کا وقت نہ آئے تو دونوں برابر ہو گئے جو عقل و انصاف کے خلاف ہے۔

آخر میں فرمایا فَمُلٰقِيْهِ۔ اس کی ضمیر كَدْحٌ کے لیے بھی ہو سکتی ہے ایسی صورت میں معنی ہوں گے کہ جو بھی جدوجہد انسان یہاں کر رہا ہے اُن سے وہ اپنے رب کے پاس پہنچ کر مل لے گا۔ اور اس کے اچھے یا بُرے نتائج اس کے سامنے آجائیں گے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مُلٰقِيْهِ کی ضمیر رب کے لئے ہو۔ تو معنی ہوں گے کہ ہر انسان آخرت میں اپنے رب سے ملنے والا ہے اور اپنے کیے کا حساب دینے والا ہے۔ اس کے آگے نیک و بد انسانوں کے الگ الگ انجام کا ذکر ہے۔

اس سارے مجموعہ پر انسان اگر غور کرے کہ ضروریات زندگی اور مرغوبات نفس کو حاصل تو نیک و بد دونوں ہی کر لیتے ہیں اور کسی نہ کسی طرح دنیا کی زندگی دونوں کی گزر جاتی ہے مگر ان دونوں کے انجام میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ایک کے نتیجہ میں کبھی نہ ختم ہونے والی راحت ہی راحت ہے اور دوسرے کے نتیجہ میں کبھی نہ ختم ہونے والی مصیبت اور عذاب ہے۔ پھر کیوں نہ انسان اس انجام کو آج ہی سوچ سمجھ کر اپنی کوشش اور عمل کا رخ اس طرف پھیر دے جو دنیا میں بھی اس کی ضرورتوں کو پورا کر دے اور آخرت کی دائمی نعمت بھی مل جائے۔

(معارف القرآن)۔

السلام وعلیکم رحمۃ اللہ وبرکاۃ

اللہ تعالیٰ ہم سب کی یہ سعی قبول فرمائے اور آخرت میں نجات کا ذریعہ بنائے۔ جس جس نے بھی اس کار خیر میں مال، جان اور صلاحیتوں کو لگایا اللہ قبول و منظور فرمائے

انجمن خدام القرآن فیصل آباد میں اس کے فوٹو کاپی بھی دستیاب ہیں اور محترم ڈاکٹر جہاں زیب صاحب کے اس کتاب میں اضافہ جات کے ساتھ مطالعہ قرآن حکیم کے نام سے دستیاب ہیں

رابطہ کے لئے: info@khuddam-ul-quran.com ,www.khuddam-ul-quran.com

03217805614,0412437618,0412437781

2004

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ الانشقاق (84)

آیت نمبر (10 تا 25)

و	س	ق

(ض) وَسۡقًا کسی چیز کے متفرق اجزا کو اکٹھا کرنا۔ جمع کرنا۔ زیر مطالعہ آیت۔17۔

(افتعال) اِتِّسَاقًا کسی چیز کے متفرق اجزا کا اکٹھا ہونا۔ جمع ہونا، اس طرح کہ وہ چیز پوری ہو جائے۔ کامل ہو جائے۔ زیر مطالعہ آیت۔18۔

ترجمہ

وَاَمَّا مَنۡ	اُوۡتِیَ کِتٰبَہٗ	وَرَآءَ ظَہۡرِہٖ ۙ﴿۱۰﴾	فَسَوۡفَ یَدۡعُوۡا ثُبُوۡرًا ۙ﴿۱۱﴾
اور وہ جو ہے جس کو	دی گئی اس کی کتاب	اس کی پیٹھ کے پیچھے سے	تو جلد ہی وہ پکارے گا ہلاک ہونے کو

وَّیَصۡلٰی سَعِیۡرًا ؕ﴿۱۲﴾	اِنَّہٗ کَانَ فِیۡۤ اَہۡلِہٖ	مَسۡرُوۡرًا ؕ﴿۱۳﴾	اِنَّہٗ ظَنَّ
اور وہ گرے گا آگ میں	بیشک وہ تھا اپنے گھر والوں میں	خوش وخرم	بیشک اس نے گمان کیا

اَنۡ لَّنۡ یَّحُوۡرَ ۚ﴿۱۴﴾	بَلٰۤی ۚ اِنَّ رَبَّہٗ	کَانَ بِہٖ بَصِیۡرًا ؕ﴿۱۵﴾
کہ وہ ہرگز واپس نہیں ہوگا	کیوں نہیں یقیناً اس کا رب	اس کو ہر حال میں دیکھنے والا تھا

فَلَاۤ اُقۡسِمُ بِالشَّفَقِ ۙ﴿۱۶﴾	وَالَّیۡلِ وَمَا وَسَقَ ۙ﴿۱۷﴾
پس نہیں! میں قسم کھاتا ہوں شفق کی	اور رات کی اور اس کی جو اس نے اکٹھا کیا

وَالۡقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ۙ﴿۱۸﴾	لَتَرۡکَبُنَّ طَبَقًا عَنۡ طَبَقٍ ؕ﴿۱۹﴾	فَمَا لَہُمۡ
اور چاند کی جب وہ کامل ہوا	تم لوگ لازماً چڑھو گے ایک منزل پر ایک منزل سے	تو ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے

لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ۙ﴿۲۰﴾	وَاِذَا قُرِیَٔ عَلَیۡہِمُ الۡقُرۡاٰنُ	لَا یَسۡجُدُوۡنَ ۩ ؕ﴿۲۱﴾
(کہ) یہ لوگ ایمان نہیں لاتے	اور جب پڑھ کر سنایا جاتا ہے ان کو قرآن	تو یہ لوگ سجدہ نہیں کرتے (السجدہ ۱۳)

بَلِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا یُکَذِّبُوۡنَ ۬ۚ﴿۲۲﴾	وَاللّٰہُ اَعۡلَمُ	بِمَا یُوۡعُوۡنَ ۚ﴿۲۳﴾
بلکہ جنہوں نے انکار کیا وہ جھٹلاتے ہیں	اور اللہ سب سے زیادہ جاننے والا ہے	اس کو جو یہ محفوظ کرتے ہیں

فَبَشِّرۡہُمۡ بِعَذَابٍ اَلِیۡمٍ ۙ﴿۲۴﴾	اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا
تو آپؐ بشارت دیں ان کو ایک دردناک عذاب کی	سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے

وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	لَہُمۡ اَجۡرٌ غَیۡرُ مَمۡنُوۡنٍ ﴿۲۵﴾ ع
اور عمل کیے نیکیوں کے	ان کے لیے ایک ایسا اجر ہے جو غیر منقطع ہے

نوٹ: 1

آیات۔ 16 تا 18۔ میں حق تعالیٰ نے چار چیزوں کی قسم کھا کر (یعنی شہادت کے طور پر پیش کر کے۔ مرتب) انسان کو بھی اس چیز کی طرف متوجہ کیا ہے جس کا ذکر اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ میں آچکا ہے۔ یہ چاروں چیزیں جن کی قسم کھائی ہے اس مضمون کی شاہد ہیں جو جواب قسم لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ میں آنے والا ہے کہ انسان کو ایک حال پر قرار نہیں ہے۔ اس کے حالات اور درجات ہر وقت بدلتے رہتے ہیں۔ پہلی چیز شفق ہے یعنی وہ سرخی جو آفتاب غروب ہونے کے بعد افق مغرب میں ہوتی ہے۔ یہ رات کی ابتداء ہے جو انسانی احوال میں ایک بڑے انقلاب کا پیش خیمہ ہے کہ روشنی جا رہی ہے اور تاریکی کا سیلاب آ رہا ہے۔ دوسری رات کی قسم ہے جو انقلاب کی تکمیل کرتی ہے۔ تیسری قسم ان چیزوں کی ہے جن کو ارات اپنے اندر سمیٹ لیتی ہے۔ یعنی وہ چیزیں جو دن کی روشنی میں منتشر پھیلی رہتی ہیں، رات کے وقت وہ سب سمٹ کر اپنے اپنے ٹھکانوں میں جمع ہو جاتی ہیں اور انسان، چرند و پرند، سب اپنے اپنے گھروں اور گھونسلوں میں جمع ہو جاتے ہیں۔ کاروبار کے پھیلے ہوئے سامان کو سمیٹ کر یکجا کر دیا جاتا ہے۔ یہ عظیم انقلاب خود انسان اور اس کے متعلقات میں ہے۔ (یعنی اسی طرح انسان بھی اپنے ''وطن'' یعنی جنت سے نکل کر اس دنیا میں منتشر پھرتا رہتا ہے۔ پھر کچھ عرصے بعد اس کو اس کے وطن کی طرف واپس سمیٹ لیا جاتا ہے۔ مرتب)۔ چوتھی قسم جس چیز کی کھائی گئی وہ وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ہے۔ اس میں چاند کے مختلف اطوار کی طرف اشارہ ہے کہ پہلے ایک نہایت خفیف قوس کی شکل میں ہوتا ہے۔ پھر اس کی روشنی روزانہ کچھ ترقی کرتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ بدر کامل ہو جاتا ہے۔ مسلسل اور پیہم انقلاباتِ احوال پر شہادت دینے والی چار چیزوں کی قسم کھا کر حق تعالیٰ نے فرمایا نے فرمایا۔ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ۔ یعنی انسان اپنی تخلیق کی ابتدا سے انتہا تک کسی بھی وقت ایک حال پر نہیں رہتا۔ بلکہ اس کے وجود پر تدریجی انقلابات آتے رہتے ہیں۔

طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ کی تفسیر حضرت جابر بن عبداللہ ؓ نے خود رسول اللہ ﷺ سے روایت کی ہے۔ یہ طویل حدیث قرطبیؒ نے اور ابن کثیرؒ نے مفصل نقل کی ہے۔ اس کا مضمون یہ ہے کہ انسان نطفہ سے منجمد خون بنا۔ پھر اس سے ایک مضغہ گوشت بنا۔ پھر اس میں ہڈیاں پیدا ہوئیں۔ پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھا اور اعضاء کی تکمیل ہوئی۔ پھر اس میں روح لا کر ڈالی گئی اور وہ ایک زندہ انسان بنا جس کی غذا بطن مادر کے اندر رحم کا گندا خون تھا۔ نو مہینے کے بعد اللہ نے اس کے دنیا میں آنے کا راستہ آسان کر دیا اور گندی غذا کی جگہ ماں کا دودھ ملنے لگا۔ دنیا کی وسیع فضا اور ہوا دیکھی، بڑھنے اور پھلنے پھولنے لگا۔ دو برس کے اندر چلنے پھرنے اور بولنے کی قوت بھی حرکت میں آئی۔ ماں کا دودھ چھوٹ کر اس سے زیادہ لذیذ اور طرح طرح کی غذائیں ملیں، کھیل کود اور لہو ولعب اس کے دن رات کا مشغلہ بنا۔ کچھ ہوش وشعور بڑھا تو تعلیم وتربیت کے شکنجے میں کسا گیا۔ جوان ہوا تو جوانی کی خواہشات نے ان کی جگہ لے لی اور ایک نیا عالم شروع ہوا۔ نکاح، شادی، اولاد اور خانہ داری کے مشاغل دن رات کا مشغلہ بن گئے۔ آخر یہ دور بھی ختم ہونے لگا۔ قویٰ میں ضعف پیدا ہوا، بیماریاں آئے دن رہنے لگیں، بڑھاپا آ گیا اور اس جہاں کی آخری منزل یعنی قبر تک پہنچنے کے سامان ہونے لگے۔ یہ سب چیزیں تو سب کی آنکھوں کے سامنے ہوتی ہیں۔ کسی کو ان سے انکار کرنے کی مجال نہیں۔ مگر حقیقت سے نا آشنا انسان سمجھتا ہے کہ یہ موت اور قبر اس کی آخری منزل ہے اور آگے کچھ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ جو خالق کائنات ہے اور علیم وخبیر ہے، اس نے آگے آنے والے مراحل کو اپنے انبیاء کے ذریعہ انسان تک پہنچایا کہ قبر تیری آخری منزل نہیں بلکہ یہ صرف ایک انتظار گاہ (ویٹنگ روم) ہے۔ آگے اس سے بھی بڑا ایک جہان آنے والا ہے۔ اس میں ایک بڑے حساب کتاب کے بعد انسان کی آخری منزل مقرر ہو جائے گی جو یا دائمی راحت ہوگی یا پھر دائمی عذاب کی۔ اور اس آخری منزل پر ہی پہنچ کر انسان انقلابات کے چکر سے نکلے گا۔

ان آیات میں انسان کو اس کی تخلیق اور دنیا میں اس کو پیش آنے والے حالات وانقلابات سامنے کر کے یہ ہدایت دی کہ عقلمند انسان کا کام یہ ہے کہ دنیا میں اپنے آپ کو مسافر سمجھے اور اپنے وطن اصلی کے لیے سامان تیار کرنے اور بھیجنے کی فکر کو ہی دنیا کا سب سے بڑا مقصد بنائے۔ پھر فرمایا کہ ان تمام روشن ہدایات کے باجود بہت سے لوگ اپنی غفلت سے باز نہیں آتے۔ ایسے لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ سب کچھ سننے کے بعد بھی اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور نہ اس کے سامنے جھکتے ہیں۔ (معارف القرآن)۔

نوٹ:2

حق تو یہ تھا کہ جب قرآن ان کو ایسی عظیم حقیقت سے آگاہ کر رہا ہے تو اس کو سننے کے بعد اس کی عظمت کے اعتراف میں اپنے رب کے آگے سجدہ میں گر پڑتے لیکن اس کے برعکس وہ اس کی تکذیب کرتے ہیں۔ یہاں اہل عرب اور اہل مصر کی یہ روایت پیش نظر رہے کہ جب وہ کسی بات کی عظمت اور صداقت کا جوش وجذبہ کے ساتھ اعتراف کرنا چاہتے تو اس کو دیکھتے یا سنتے ہی سجدے میں گر پڑتے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ کے لیے فرعون نے جن ساحروں کو اکٹھا کیا تھا انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی صداقت اور ان کے معجزات کی عظمت کا اعتراف اسی طرح کیا تھا۔ عرب کے مشہور شاعر لبید کے قصیدے کے ایک شعر پر بھی اس وقت کے مشہور شعراء عرب نے سجدہ کیا جس کی بنا پر اس کا قصیدہ خانۂ کعبہ پر آویزاں کیا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ قرآن اپنی بلاغت وصداقت میں ان چیزوں سے بدرجہا بلند ہے لیکن جو لوگ اس کی قدر و قیمت سے ناآشنا تھے (اور ہیں) وہ اللہ کو سجدہ کرنے کے بجائے اس کی تکذیب کرتے ہیں۔ (تدبر قرآن)۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ البروج (85)

آیت نمبر (1 تا 10)

ترکیب

(آیت۔4) یہ ہم بتا چکے ہیں کہ فعل ماضی میں دعا کا مفہوم بھی ہوتا ہے۔ (دیکھیں آیت۔2/البقرۃ:72، نوٹ۔2) یہاں قُتِلَ ماضی مجہول کا بھی دونوں طرح ترجمہ ہوسکتا ہے۔ ہم دعائیہ ترجمہ کریں گے۔ (آیت۔5) اَلنَّارِ کی جر بتا رہی ہے کہ اس سے پہلے اس کا مضاف اَصۡحٰبُ محذوف ہے۔ یہ مرکب اضافی اَصۡحٰبُ الۡاُخۡدُوۡدِ کا بدل ہے، جبکہ ذَاتِ الۡوَقُوۡدِ صفت ہے اَلنَّارِ کی ہے۔ (آیت۔6) عَلَیۡهَا میں هَا کی ضمیر اُخۡدُوۡدِ کے لیے بھی ہوسکتی ہے۔ اور اَلنَّارِ کے لیے بھی۔ (آیت۔7) وَهُمۡ علی میں واو حالیہ ہے۔

ترجمہ

وَالسَّمَآءِ	ذَاتِ الۡبُرُوۡجِ ۙ﴿۱﴾	وَالۡیَوۡمِ الۡمَوۡعُوۡدِ ۙ﴿۲﴾	وَشَاهِدٍ
قسم ہے آسمان کی	جو (سیاروں کی) منزلوں والا ہے	اور قسم ہے وعدہ کیے ہوئے دن کی	اور قسم ہے حاضر ہونے والے کی

وَّمَشۡهُوۡدٍ ؕ﴿۳﴾	قُتِلَ اَصۡحٰبُ الۡاُخۡدُوۡدِ ۙ﴿۴﴾	النَّارِ	ذَاتِ الۡوَقُوۡدِ ۙ﴿۵﴾
اور قسم ہے معائنہ کیے جانے والے کی	مارے جائیں خندقوں والے	اُس آگ (والے) جو	ایندھن والی ہے

اِذۡ هُمۡ عَلَیۡهَا	قُعُوۡدٌ ۙ﴿۶﴾	وَّهُمۡ	عَلٰی مَا یَفۡعَلُوۡنَ	بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ
جب وہ لوگ ان (خندقوں) پر	بیٹھنے والے تھے	اس حال میں کہ وہ	اس پر جو وہ لوگ کرتے تھے	ایمان لانے والوں کے ساتھ

شُهُوْدٌ ۝۷	وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ	اِلَّآ اَنْ	يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ	الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۝۸
حاضر رہنے والے ہوتے تھے	اوران لوگوں نے سزانہیں دی ان کو	سوائے اس (بات) کے کہ	وہ لوگ ایمان لائے اللہ پر	جو بالادست ہے حمد کیا ہوا ہے

الَّذِيْ لَهٗ	مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ	وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ	شَهِيْدٌ ۝۹
وہ جس کے لیے ہی	زمین اور آسمانوں کی بادشاہت ہے	اور اللہ ہر چیز پر	موجود رہنے والا ہے

اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا	الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ	ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا
یقیناً جن لوگوں نے مشکل میں ڈالا	ایمان لانے والوں کو اور ایمان لانے والیوں کو	پھر توبہ (بھی) نہیں کی

فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ	وَلَهُمْ	عَذَابُ الْحَرِيْقِ ۝۱۰
تو ان کے لیے جہنم کا عذاب ہے	اور ان کے لیے ہی	شعلے کا عذاب ہے

نوٹ: 1

اس آیت۔1۔میں بروج سے مراد جمہور مفسرین کے نزدیک بڑے بڑے ستارے ہیں۔حضرت ابن عباسؓ کا یہی قول ہے۔بعض مفسرین نے بروج سے مراد قصور یعنی محلات لیے ہیں اور اس سے مراد وہ مقامات ہیں جو آسمان میں پہرے داروں اور نگراں فرشتوں کے لیے مقرر ہیں۔بعض متاخرین (بعد میں آنے والے) نے اس سے مراد وہ بروج بتلائے ہیں جو فلاسفہ کی اصطلاح ہے، جس میں کل آسمان کو بارہ حصوں میں تقسیم کر کے ہر حصہ کو ایک برج کہا جاتا ہے۔ان کا خیال یہ ہے کہ ثابت ستارے انہی برجوں میں اپنی اپنی جگہ مقیم ہیں۔اور سیارے حرکت فلک کے ساتھ متحرک ہوتے ہیں۔اور ان برجوں میں سیاروں کا نزول ہوتا ہے۔مگر یہ سراسر غلط ہے۔قرآن کریم سیاروں کو آسمانوں میں مرکوز نہیں قرار دیتا بلکہ سیارے کو اپنی ذاتی حرکت سے متحرک قرار دیتا ہے۔جیسا کہ سورۂ یٰسین میں ہے وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ (اور وہ سب کے سب فلک میں تیرتے ہیں) فلک سے مراد یہاں آسمان نہیں بلکہ سیارے کا مدار ہے جس میں وہ حرکت کرتا ہے۔(معارف القرآن)

نوٹ: 2

اصحاب الاخدود سے کون مراد ہیں؟ مفسرین نے کئی واقعات نقل کیے ہیں۔لیکن صحیح مسلم، جامع ترمذی اور مسند احمد وغیرہ میں جو قصہ مذکور ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ پہلے زمانے میں کوئی کافر بادشاہ تھا۔اس کے ہاں ایک ساحر رہتا تھا۔جب اس کی موت کا وقت قریب ہوا تو اس نے بادشاہ سے درخواست کی کہ ایک ہوشیار اور ہونہار لڑکا مجھے دیا جائے تو میں اپنا علم اس کو سکھا دوں تا کہ میرے بعد یہ علم مٹ نہ جائے۔چنانچہ ایک لڑکا تجویز کیا گیا جو روزانہ ساحر کے پاس جا کر اس کا علم سیکھتا تھا۔راستہ میں ایک عیسائی راہب رہتا تھا جو اس وقت کے دین حق پہ تھا۔لڑکا اس کے پاس بھی آنے جانے لگا۔اور خفیہ طور پر راہب کے ہاتھ پر مسلمان ہو گیا۔اور اس کے فیض صحبت سے ولایت و کرامت کے درجے کو پہنچا۔ایک روز لڑکے نے دیکھا کہ کسی بڑے جانور (شیر وغیرہ) نے راستہ روک رکھا ہے جس کی وجہ سے مخلوق پریشان ہے۔اس نے ایک پتھر ہاتھ میں لے کر دعا کی کہ اے اللہ اگر راہب کا دین سچا ہے تو یہ جانور میرے ہاتھ سے مارا جائے۔یہ کہہ کر پتھر پھینکا جس سے اس جانور کا کام تمام ہو گیا۔لوگوں میں شور ہوا کہ اس لڑکے کو عجیب علم آتا ہے۔کسی اندھے نے سن کر درخوست کی کہ میری آنکھیں اچھی کر دو۔لڑکے نے کہا کہ اچھی کرنے والا میں نہیں۔وہ اللہ ہے۔اگر تو اس پر ایمان لے آئے تو میں دعا کروں۔امید ہے وہ تجھے بینا کر دے گا۔چنانچہ ایسا ہی ہوا۔یہ خبریں بادشاہ کو پہنچیں۔اس نے برہم ہو کر لڑکے کو مع راہب اور اندھے کے طلب کر لیا۔اور کچھ بحث کے بعد راہب اور اندھے کو قتل کر دیا۔لڑکے کے لیے حکم دیا کہ اس کو اونچے پہاڑ پر سے گرا کر ہلاک کر دیا جائے۔مگر خدا کی قدرت سے جو لوگ اس کو لے گئے تھے وہ پہاڑ سے گر کر ہلاک ہو گئے اور لڑکا واپس آ گیا۔پھر بادشاہ نے اسے دریا میں غرق کرنے کا حکم دیا۔وہاں بھی یہی ہوا کہ لڑکا بچ کر آ گیا اور جو گئے تھے وہ دریا میں ڈوب گئے۔آخر لڑکے نے بادشاہ سے کہا کہ میں خود اپنے مرنے کی ترکیب بتاتا ہوں۔آپ سب لوگوں کو ایک میدان میں جمع کریں۔ان

کے سامنے مجھ کو سولی پر لٹکائیں۔ اور یہ لفظ کہہ کر مجھے تیر ماریں ''بسم اللہ رب الغلام'' بادشاہ نے ایسا ہی کیا اور لڑکا اپنے رب کے نام پر قربان ہو گیا۔ یہ عجیب واقعہ دیکھ کر لوگوں کی زبان سے ایک نعرہ بلند ہوا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْغُلَامِ۔ لوگوں نے بادشاہ سے کہا کہ جس چیز کی روک تھام کر رہے تھے وہی پیش آئی۔ پہلے تو کئی ایک دو مسلمان ہوتا تھا لیکن اب خلق کثیر نے اسلام قبول کر لیا۔ بادشاہ نے غصے میں آ کر بڑی بڑی خندقیں کھدوائیں اور ان کو آگ سے بھروا کر اعلان کیا کہ جو شخص اسلام سے نہ پھرے گا اس کو ان خندقوں میں جھونک دیا جائے گا۔ لوگ آگ میں ڈالے جا رہے تھے لیکن اسلام سے نہیں ہٹتے تھے۔ بادشاہ اور اس کے وزیر و مشیر خندقوں کے آس پاس بیٹھے ہوئے مسلمانوں کے جلنے کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ (ترجمہ شیخ الہندؒ)

یہ بادشاہ جس کا ذکر اس قصہ میں ہے ملک یمن کا بادشاہ تھا جس کا نام حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں یوسف ذونواس تھا۔ اس کا زمانہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت سے ستر سال پہلے کا زمانہ تھا۔ اور یہ لڑکا جس کو ساحر کے پاس اس فن سیکھنے کے لیے بادشاہ نے مامور کیا تھا، اس کا نام عبداللہ بن تامر تھا۔ محمد بن اسحٰق کی روایت میں ہے کہ یہ لڑکا جس جگہ مدفون تھا وہ جگہ کسی ضرورت سے حضرت فاروق اعظمؓ کے زمانے میں کھودی گئی تو اس میں عبداللہ بن تامر کی لاش صحیح سالم اس طرح برآمد ہوئی کہ بیٹھے ہوئے تھے اور ان کا ہاتھ اس جگہ پر رکھا ہوا تھا، جہاں تیر لگا تھا۔ کسی نے ان کا ہاتھ اس جگہ سے ہٹایا تو زخم سے خون جاری ہو گیا۔ پھر ویسے ہی رکھ دیا تو بند ہو گیا۔ ان کے ہاتھ میں ایک انگوٹھی تھی جس پر لکھا ہوا تھا اَللّٰہُ رَبِّیْ۔ (ابن کثیر)۔ ابن ابی حاتم کے حوالے سے ابن کثیرؒ نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ آگ کی خندق کا واقعہ دنیا میں ایک ہی نہیں، بلکہ بہت ملکوں اور زمانوں میں ہوئے ہیں۔ پھر ابن ابی حاتم نے ان میں سے تین کا خصوصیت سے ذکر کیا کہ ایک خندق یمن میں تھی، دوسری شام میں اور تیسری فارس میں تھی۔ مگر قرآن کریم نے جس خندق کا ذکر اس سورت میں کیا ہے وہ ملک یمن کی خندق ہے کیونکہ یہی عرب کے ملک میں تھی۔ (معارف القرآن، ص ۷۱۳۔ ۷۱۴۔ سے ماخوذ)

آیت نمبر (11 تا 22)

ترکیب

(آیت۔ 11) اَلْفَوْزُ الْکَبِیْرُ مرکب توصیفی ہے۔ لیکن یہ ذٰلِکَ کا مُشَارٌ اِلَیْہِ نہیں ہے، بلکہ یہ اس کی خبر معرفہ ہے اور اس سے پہلے ضمیر فاصل ھُوَ محذوف ہے۔ پورا جملہ اس طرح ہے ذٰلِکَ ھُوَ الْفَوْزُ الْکَبِیْرُ۔ (آیت۔ 15) اَلْمَجِیْدُ کی رفع بتا رہی ہے کہ نہ تو یہ اَلْعَرْشِ کی صفت ہے اور نہ ہی ذُوْ کا مضاف الیہ ہے کیونکہ دونوں صورتوں میں یہ حالت جر میں اَلْمَجِیْدِ آتا ہے۔ اس کی رفع سے معلوم ہوا کہ یہ وَھُوَ الْغَفُوْرُ کے مبتدا ھُوَ پر عطف ہے یا یوں کہہ لیں کہ اس سے پہلے اس کا مبتدا ھُوَ محذوف ہے۔ (آیت۔ 16) فَعَّالٌ سے پہلے بھی اس کا مبتدا ھُوَ محذوف ہے۔ (آیت۔ 17) حَدِیْثُ کا مضاف الیہ اَلْجُنُوْدِ ہے، لیکن یہ آگے فِرْعَوْنَ وَثَمُوْدَ کا مضاف نہیں ہو سکتا کیونکہ مضاف پر لام تعریف نہیں آتا۔ نیز یہ کہ فِرْعَوْنَ اور ثَمُوْدَ دونوں غیر منصرف ہیں۔ اس لیے ان کی یہ حالت نصب بھی ہو سکتی ہے اور حالت جر بھی۔ لیکن یہاں ان کے نصب میں ہونے کی کوئی وجہ یا قرینہ یا قیاس موجود نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہاں یہ دونوں حالت جر میں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں بھی حَدِیْثُ کا مضاف الیہ ہیں۔ اس طرح یہ حَدِیْثُ الْجُنُوْدِ کا بدل بعض ہیں۔

ترجمہ

2004

اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا	وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	لَهُمۡ جَنّٰتٌ	تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا
بیشک وہ لوگ جو ایمان لائے	اور انہوں نے عمل کیے نیکیوں کے	ان کے لیے ہی ایسے باغات ہیں	بہتی ہیں جن کے نیچے سے

الۡاَنۡهٰرُ ؕ	ذٰلِكَ الۡفَوۡزُ الۡكَبِيۡرُ ؕ ١١	اِنَّ بَطۡشَ رَبِّكَ	لَشَدِيۡدٌ ؕ ١٢
نہریں	یہ ہی سب سے بڑی کامیابی ہے	بیشک آپؐ کے رب کی گرفت	یقیناً بڑی سخت ہے

اِنَّهٗ هُوَ	يُبۡدِئُ	وَيُعِيۡدُ ۚ ١٣	وَهُوَ الۡغَفُوۡرُ	الۡوَدُوۡدُ ۙ ١٤
حقیقت تو یہ ہے کہ	وہ (ہی) ابتدا کرتا ہے	اور وہ (ہی) لوٹائے گا	اور وہ ہی بے انتہا بخشنے والا	انتہائی خیر خواہ ہے

ذُو الۡعَرۡشِ	الۡمَجِيۡدُ ۙ ١٥	فَعَّالٌ	لِّمَا	يُرِيۡدُ ؕ ١٦	هَلۡ اَتٰٮكَ
جو عرش کا مالک ہے	وہ ہی عظیم الشان ہے	وہ کر گزرنے والا ہے	اس کا جس کا	وہ ارادہ کرتا ہے	کیا پہنچی آپؐ کے پاس

حَدِيۡثُ الۡجُـنُوۡدِ ۙ ١٧	فِرۡعَوۡنَ وَثَمُوۡدَ ؕ ١٨	بَلِ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا	فِىۡ تَكۡذِيۡبٍ ۙ ١٩
لشکروں کی بات	(جیسے) فرعون اور ثمود کی (بات)	بلکہ جنہوں نے انکار کیا وہ لوگ	جھٹلانے میں (پڑے ہوئے) ہیں

وَّاللّٰهُ	مِنۡ وَّرَآئِهِمۡ	مُّحِيۡطٌ ۚ ٢٠	بَلۡ هُوَ قُرۡاٰنٌ مَّجِيۡدٌ ۙ ٢١
درآنحالیکہ اللہ	ان کے پیچھے سے (ان کو)	گھیرنے والا ہے	بلکہ وہ ایک ایسا عظیم الشان قرآن ہے جو

فِىۡ لَوۡحٍ	مَّحۡفُوۡظٍ ۢ ٢٢
ایک ایسی تختی میں (لکھا ہوا) ہے جو	محفوظ کی ہوئی ہے

نوٹ: 1 اہل ایمان کی حوصلہ افزائی کے بعد سابقہ آیات میں کافروں کو جو دھمکیاں دی گئی ہیں، ان کو مزید موکد اور مدلل کرنے کے لیے آیات۔ 12 تا 16۔ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی کچھ مزید صفات کی یاد دہانی کرائی ہے۔ اور ان دھمکیوں کو حقیقی ثابت کرنے کے لیے آیات۔ 17۔ 18۔ میں تاریخی حقائق کی طرف اشارہ فرما دیا۔ پھر ان میں سے قوم ثمود اور فرعون کا ذکر خاص اہتمام سے فرمایا ہے۔ قریش کے لیڈروں پر ان دونوں قوموں کی عظمت و شوکت کی بڑی دھاک تھی۔ ان کی طرف اشارہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ دیکھ لو، جب خدا نے ان کو پکڑا تو چشم زدن میں وہ صفحہ ہستی سے مٹ گئے۔ (تدبر قرآن ص ۲۹۲۔ ۲۹۳۔ سے ماخوذ)

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

سورۃ الطارق (86)

آیت نمبر (1 تا 17)

د ف ق

(ن) دُفُوۡقًا پانی کا اُبل کر گرنا۔ اچھل کر بہنا۔

دَافِقٌ اسم الفاعل ہے۔اچھل کر بہنے والا۔زیر مطالعہ آیت۔6۔ 2004

ھ ز ل

(ن۔س) هَزْلًا لاغر و کمزور ہونا۔

(ض) هَزْلًا مذاق وٹھٹھا کرنا۔بے نتیجہ یا لاحاصل بات کرنا۔

هَزْلٌ اسم صفت بھی ہے۔کمزور۔لاحاصل۔بے نتیجہ۔(جب یہ قول کی صفت کے طور پر آئے تو کمزور بات کا مطلب ہے ایسی بات جس کی کوئی سند یا دلیل نہ ہو اور لاحاصل بات کا مطلب ہے ایسی بات جس کا اچھا یا برا کوئی بھی نتیجہ نکلنے والا نہ ہو۔(زیر مطالعہ آیت۔14)

ترکیب

(آیت۔4) اس آیت میں اِنْ کو اِنْ مخففہ بھی مانا گیا ہے اور اِنْ نافیہ بھی۔جو لوگ اسے اِنْ مخففہ مانتے ہیں وہ لَمَّا کو لَمَا (میم بغیر تشدید کے پڑھتے ہیں) اور لام کو اِنَّ کی خبر پر آنے والا لام تاکید مانتے ہیں اور مَا کو زائدہ مانتے ہیں۔اور جو لوگ اسے اِنْ نافیہ مانتے ہیں وہ لَمَّا کو اِلَّا کے مفہوم میں لیتے ہیں۔ہم اِنْ نافیہ کے طور پر ترجمہ کریں گے۔(آیت۔8) اِنَّهٗ کی ضمیر اللہ تعالیٰ کے لیے ہے جبکہ رَجْعِهٖ میں ہٖ کی ضمیر اَلْاِنْسَانُ کے لیے ہے۔(آیت۔13۔14) اِنَّهٗ میں ہٗ اور مَا هُوَ میں هُوَ، یہ دونوں ضمیریں قرآن مجید کے لیے ہیں۔فَصْلٌ اور اَلْهَزْلِ، یہ دونوں قولٌ کی صفت ہیں۔اَلْهَزْلِ سے پہلے اَلْقَوْلِ محذوف ہے۔یعنی پورا جملہ یوں ہے وَمَا هُوَ بِالْقَوْلِ الْهَزْلِ۔لَقَوْلٌ فَصْلٌ مرکب توصیفی بن کر اِنَّ کی خبر ہے جبکہ (بِالْقَوْلِ) الْهَزْلِ مرکب توصیفی پھر مرکب جاری بن کر مَا نافیہ کی خبر ہے۔اور یہ دونوں خبریں قرآن کے متعلق ہیں۔(آیت۔17) مَهِّلْ باب تفعیل کا فعل امر ہے جس میں کام کو تدریجاً اور تسلسل سے کرنے کا مفہوم ہوتا ہے۔اس لیے اس کا مطلب ہے تُو ڈھیل دیتا رہ۔جبکہ باب افعال میں تدریج اور تسلسل کا مفہوم نہیں ہوتا۔اس لیے اس کے فعل امر اَمْهِلْ کا مطلب ہے تُو مہلت دے۔

ترجمہ

وَالسَّمَآءِ	وَالطَّارِقِ ۙ①	وَمَآ اَدْرٰىكَ	مَا الطَّارِقُ ۙ②
قسم ہے آسمان کی	اور قسم ہے رات میں آنے والے کی	اور کیا سمجھا تو نے	کیا ہے رات میں آنے والا

النَّجْمُ الثَّاقِبُ ۙ③	اِنْ كُلُّ نَفْسٍ	لَّمَّا	عَلَيْهَا حَافِظٌ ؕ④	فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ
وہ چمکنے والا تارا ہے	نہیں ہے کوئی بھی جان	مگر نہ ہو	(کہ) اس پر ہے کوئی نگرانی کرنے والا	پس چاہیے کہ غور کرے انسان

مِمَّ خُلِقَ ؕ⑤	خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ ۙ⑥	يَّخْرُجُ	مِنْۢ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ ؕ⑦
کس چیز سے اس کو پیدا کیا گیا	وہ پیدا کیا گیا اچھل کر بہنے والے پانی سے	جو نکلتا ہے	پیٹھ اور پسلیوں کے درمیان سے

اِنَّهٗ عَلٰى رَجْعِهٖ	لَقَادِرٌ ؕ⑧	يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ ۙ⑨	فَمَا لَهٗ	مِنْ قُوَّةٍ
بیشک وہ اس کی واپسی پر	یقیناً قدرت رکھنے والا ہے	جس دن جانچا جائے گا بھیدوں کو	تو نہیں ہوگی اس کے لیے	کوئی بھی قوت

وَّلَا نَاصِرٍ ؕ⑩	وَالسَّمَآءِ	ذَاتِ الرَّجْعِ ۙ⑪	وَالْاَرْضِ	ذَاتِ الصَّدْعِ ۙ⑫
اور نہ کوئی بھی مدد کرنے والا	قسم ہے آسمان کی	جو بارش والا ہے	اور قسم ہے زمین کی	جو دراڑ والی ہے

اِنَّهٗ	لَقَوْلٌ فَصْلٌ ﴿۱۳﴾	وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ ﴿۱۴﴾	اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ	كَيْدًا ﴿۱۵﴾
بیشک یہ (قرآن)	یقیناً ایک فیصلہ کن بات ہے	اور یہ لاحاصل (بات) نہیں ہے	بیشک یہ لوگ چالبازی کرتے ہیں	جیسے چالبازی کرنے کا حق ہے

وَّاَكِيْدُ	كَيْدًا ﴿۱۶﴾	فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ	اَمْهِلْهُمْ	رُوَيْدًا ﴿۱۷﴾
اور میں خفیہ تدبیر کروں گا	جیسے تدبیر کرتے ہیں	تو آپ ڈھیل دیتے رہیں کافروں کو	(یعنی) آپ مہلت دیں ان کو	غیر محسوس طریقہ سے

نوٹ:1

آیت۔4۔ میں حافظ سے مراد فرشتے ہیں جو ہر آدمی کے ساتھ رہتے ہیں۔ اس کو بلاؤں سے بچاتے ہیں اور اس کے عمل لکھتے ہیں۔ اس کے لیے ستاروں کی قسم کھانے میں شاید اس طرف اشارہ ہو کہ جس نے آسمان پر ستاروں کی حفاظت کے لیے سامان کیے ہیں، اس کو زمین پر تمہاری اور تمہارے اعمال کی حفاظت کرنا کیا دشوار ہے۔ نیز جس طرح آسمان پر ستارے ہر وقت محفوظ ہیں مگر ان کا ظہور شب میں ہوتا ہے، اسی طرح سارے اعمال نامۂ اعمال میں اس وقت بھی محفوظ ہیں مگر ان کا ظہور قیامت میں ہوگا۔ اس لیئے انسان کو قیامت کی فکر کرنا چاہیے اور اگر وہ اس کی بعید از قیاس سمجھتا ہے تو اس کو غور کرنا چاہیے کہ وہ کس چیز سے بنا ہے۔ نطفہ سے انسان بنا دینا زیادہ عجیب ہے بہ نسبت دوبارہ بنانے کے۔ جب یہ عجیب بات اللہ کے حکم سے واقع ہو رہی ہے تو جائز نہیں کہ اس سے کم عجیب بات کے وقوع کا انکار کیا جائے۔ (ترجمہ شیخ الہندؒ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ہر مومن پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تین سو ساٹھ فرشتے اس کی حفاظت کے لیے مقرر ہیں جو انسان کے ہر ہر عضو کی حفاظت کرتے ہیں۔ ان میں سے سات فرشتے صرف انسان کی آنکھ کی حفاظت کے لیے مقرر ہیں۔ یہ فرشتے انسان سے ہر ایسی لا و مصیبت جو اس کے لیے مقدر نہیں، اس طرح دور کرتے ہیں جیسے شہد کے برتن پر آنے والی مکھیوں کو پنکھے وغیرہ سے دور کیا جاتا ہے۔ (معارف القرآن)

نوٹ:2

آیات۔13۔14۔ کا مطلب یہ کہ یہ قرآن اور جو کچھ وہ قیامت کے متعلق بیان کرتا ہے، کوئی ہنسی مذاق کی بات نہیں ہے بلکہ حق و باطل کا دو ٹوک فیصلہ ہے۔ اس سے پہلے آیات۔ 11۔12۔ کی قسم کو اس بات سے یہ مناسبت ہوئی کہ قرآن آسمان سے آتا ہے اور جس میں قابلیت (یعنی حق کی طلب۔ مرتب) ہو اسے مالا مال کر دیتا ہے جیسے بارش آسمان سے آتی ہے اور عمدہ زمین کو فیضیاب کرتی ہے۔ نیز قیامت میں ایک غیبی بارش ہوگی جس سے مردے زندہ ہو جائیں گے جیسے یہاں بارش سے مردہ زمین سرسبز ہو کر لہلہانے لگتی ہے۔ (ترجمہ شیخ الہندؒ)

نوٹ:3

آیت۔17۔ میں کافروں کو مہلت دینے کی وجہ سے مفسرین نے یہ بتائی ہے کہ یہ لوگ اللہ سے بچ کر کہیں جا تو سکتے نہیں، اس لیے ان کو مہلت دو تا کہ یہ لوگ جو کرنا چاہتے ہیں وہ کر لیں اور ان پر اتمام حجت ہو جائے۔ آخر کار اللہ نے ان کو پکڑنا تو ہے ہی، لیکن میرا ذہن یہ کہتا ہے کہ بات یہاں ختم نہیں ہو جاتی کافروں کو ڈھیل دیتے رہنے کی ہدایت کو جب ہم عمومیت پر رکھ کر سوچتے ہیں تو اس ہدایت میں ہمیں اپنی رہنمائی کے کچھ اور پہلو بھی سمجھ میں آتے ہیں۔

اس دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہر عقیدے اور مذہب کے مجرمین، اور ہر نوعیت کے مجرمین کو تا حیات مہلت ملی ہوئی ہے، اِلاَّ مَا شَاءَ اللّٰہ یہ بات اصولی طور پر بھی سمجھ میں آتی ہے۔ کمرۂ امتحان میں طالب علم جب اپنا پرچہ حل کر رہے ہوتے ہیں تو کوئی طالب علم خواہ کتنا بھی غلط جواب لکھ رہا ہو، اس پر کوئی نہ روک ٹوک ہوتی ہے نہ کوئی گرفت ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وقت ختم ہونے کی گھنٹی بجنے کے بعد جب اس سے کاپی لے لی جائے گی تب دیکھا جائے گا کہ اس نے کیا صحیح لکھا ہے اور کیا غلط۔ پھر اسی لحاظ سے اس کو نمبر ملیں گے۔

اس لیے گھنٹی بجنے تک ہر طالب علم کو مہلت ملی ہوئی ہے اور اسے آزادی (ڈھیل) بھی حاصل ہے کہ جو چاہے جواب لکھے۔ اس مہلت اور ڈھیل کا ایک مثبت پہلو بھی ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ غلط جواب لکھتے ہوئے طالب علم کو اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا ہے اور بھولا ہوا سبق یاد آجاتا ہے تو وہ غلط جواب کاٹ کر اس کو اس کی جگہ صحیح جواب لکھ دیتا ہے۔ یہ سہولت اسے اس لیے حاصل ہوئی کہ گھنٹی بجنے سے پہلے پہلے اس پر کوئی روک ٹوک اور گرفت نہیں تھی۔

اسی طرح یہ دنیا ہماری زندگی کا کمرۂ امتحان ہے۔ موت کی گھنٹی بجنے تک ہماری مہلت ہے اور کوئی کام کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کرنے کی آزادی (ڈھیل) بھی ہم کو حاصل ہے۔ ہم کو یہ ڈھیل بھی حاصل ہے کہ جب چاہیں اپنا کوئی فیصلہ منسوخ کر کے اس کی جگہ کوئی نیا فیصلہ کر لیں۔ اس مہلت اور ڈھیل کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے اندر خود اپنی اصلاح کرنے کا جو میکنزم رکھا ہے، اسے کام کرنے کا پورا پورا موقع ملے۔

البتہ ایک فرق ہے۔ طالب علم کے کمرۂ امتحان میں اس کے کچھ لکھنے یا نہ لکھنے کے فیصلے میں کسی قسم کی کوئی مداخلت نہیں ہوتی۔ لیکن زندگی کے اس کمرۂ امتحان میں انسان پر کوئی مشکل، کوئی مصیبت آتی رہتی ہے جو کوئی کام کرنے یا نہ کرنے کے فیصلوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اس طرح مداخلت ہوئی لیکن مہلت اور ڈھیل کی طرح یہ مداخلت بھی انسان کے حق میں مفید ہے۔ انسان کے اندر اپنی اصلاح کرنے کے میکنزم کی بیٹری کبھی اتنی ڈاؤن ہو جاتی ہے کہ وہ سلف اسٹارٹ نہیں رہتی، لیکن اللہ تعالیٰ کے علم کے مطابق اس بیٹری میں ابھی اتنی جان باقی ہوتی ہے کہ وہ دھکا اسٹارٹ ہو سکتی ہے، اُس وقت کسی مشکل یا کسی مصیبت کی شکل میں دھکا لگایا جاتا ہے تاکہ انسان اگر چاہے تو اس کی مدد سے اپنی اصلاح کرنے کی بیٹری کو اسٹارٹ کر لے۔ کچھ لوگ اس دھکے سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور کچھ لوگ اس موقع کو بھی ضائع کر دیتے ہیں۔ دیکھا گیا ہے کہ اس طرح کے دھکوں سے فائدہ اٹھانے والوں کی تعداد اہل ایمان میں دوسروں کی بہ نسبت زیادہ ہوتی ہے۔ واضح رہے کہ یہاں مجرمین کی بات ہو رہی ہے اس لیے انہیں کی مشکلات اور مصائب کو یہاں دھکا کہا گیا ہے۔ صالحین، صدیقین اور انبیاء کرام کی مشکلات اور مصائب کی حکمتیں اور مصلحتیں کچھ اور ہیں جن کی وضاحت کا یہ موقعہ نہیں ہے۔

اس ڈھیل دینے اور مہلت دینے کی ہدایت میں ان لوگوں کے لیے بڑی اہم رہنمائی ہے جو کسی کی تربیت کرنے کے ذمہ دار ہوتے ہیں، جیسے والدین، اساتذہ، افسران، وغیرہ۔ اس رہنمائی کے اہم مدارج کو سورۂ تغابن کی آیت۔ 14۔ میں مزید کھولا گیا ہے۔ وہاں پر قرآن کے الفاظ یہ ہیں۔ وَاِنْ تَعْفُوْا (اور اگر تم لوگ ڈھیل دو) وَتَصْفَحُوْا (اور دیکھی اَن دیکھی کر جاؤ) وَتَغْفِرُوْا (اور معاف کرو) فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ ان دونوں مقامات پر غور کرنے سے ہمیں قرآن مجید کا وہ فارمولا مل جاتا ہے جو انسانوں کو عموماً اور اہل ایمان کو خصوصاً اپنے جونیرز کی تربیت کرنے کے لیے دیا گیا ہے۔ اس فارمولے کی وضاحت ''جینے کا سلیقہ'' حصہ سوم کے صفحہ 74 تا 86 پر کی گئی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ یہاں پر اس کا خلاصہ دینا بھی ممکن نہیں ہے۔ البتہ اس میں دی گئی مثال کو ہم یہاں نقل کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ اس سے فارمولا کسی حد تک واضح ہو جائے گا۔

ہم ساتویں یا آٹھویں جماعت میں پڑھتے تھے جب ہمیں سینما دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ والد مرحوم سے اجازت مانگی تو نہیں ملی۔ ہم نے والدہ مرحومہ اور دیگر لوگوں سے سفارش کروائی، رونا دھونا بھی کیا، اسکول کا ہوم ورک کرنے کی ہڑتال کی، دو تین وقت کی بھوک ہڑتال بھی کی۔ یہ سب کچھ کرنے کی ہمیں اجازت ملی یعنی ان حرکتوں پر نہ تو ہماری پٹائی ہوئی اور نہ ڈانٹ پڑی لیکن سینما دیکھنے کی اجازت پھر بھی نہیں لی۔

چنانچہ ہم نے چوری چھپے سینما دیکھنے کا فیصلہ کرلیا لیکن اس میں کچھ قباحتوں سے سابقہ پڑا۔ پہلی قباحت یہ تھی کہ اس طرح شوق پورا کرنا ناممکن تھا کیونکہ ہماری خواہش تھی کہ شہر میں جو بھی پکچر لگے وہ سب دیکھی جائے، لیکن اس پر عمل کرنا ممکن نہیں تھا۔ جب کسی پکچر کی بہت تعریف سنتے تھے تب اسے دیکھنے کا پروگرام بناتے تھے۔ شام کو کھیلنے کا جو وقت تھا، اس سے پہلے گھر سے نکلنے کے لیے اور مغرب سے پہلے واپس نہ آنے کے لیے کوئی بہانا گھڑنا پڑتا تھا۔ سینما ہال کے باہر اور اندھر دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کوئی جاننے والا دیکھ نہ لے، وغیرہ وغیرہ۔ بہرحال اس طرح چوری چھپے پکچر دیکھ کر جب ہم بخیریت گھر واپس آجاتے تھے تو سکھ کا سانس لیتے تھے۔

کچھ عرصہ میں ایک نئی فکر لاحق ہوگئی کہ پتہ نہیں ہماری اس چوری کا والد صاحب کو علم ہے کہ نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گھر واپس آکر جو ہم سکھ کا سانس لیتے تھے وہ رخصت ہوا۔ اب رات اس ادھیڑ بن میں گزرتی تھی کہ اگر والد صاحب کو پتہ ہے تو وہ اجازت ہی کیوں نہیں دے دیتے۔ اگر نہیں معلوم اور کبھی معلوم ہو گیا تو پھر کیا ہوگا۔ جلد ہی احساس ہو گیا کہ یہ تو گناہ بے لذت ہے۔ پکچر دیکھ کر گناہ بھی کرتے ہیں اور واپس آکر پریشانی بھی مول لیتے ہیں۔ چنانچہ فیصلہ کرلیا کہ اب پکچر نہیں دیکھیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ملازمت کے سلسلہ میں جب دوسرے شہروں میں تنہا رہنے کا موقع ملا، اس وقت تک سینما دیکھنے کا شوق مرجھا چکا تھا۔ احباب کے اصرار پر کبھی کبھار چلے جاتے تھے لیکن کچھ عرصہ بعد یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا ہے۔

اس رام کہانی کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ دیکھی اَن دیکھی کر جانے کا اثر ہوتا ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ اتنی جلدی نہ ہو اور اتنا واضح نہ ہو۔ اس لیے جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے اور اس ہدایت کو اثر کرنے کا موقع دینا چاہیے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ الاعلیٰ (78)

آیت نمبر (1 تا 19)

ترکیب

(آیت۔1) اَلۡاَعۡلَی پر رفع، نصب، جر ظاہر نہیں ہوتی۔ اس لیے گرامر کے لحاظ سے یہ ممکن ہے کہ اس کو حالت نصب میں مانا جائے تو یہ اسم کی صفت ہوگا اور اگر حالت جر میں مانیں تو یہ رَبِّ کی صفت ہوگا۔ لیکن مضمون کے لحاظ سے مناسب یہی ہے کہ اس کو رَبِّ کی صفت مانا جائے۔ (آیت۔2۔3) خَلَقَ۔ سَوّٰی۔ قَدَّرَ۔ ھَدٰی۔ ان افعال کے مفعول محذوف ہیں۔ اس لیے مفہوم میں وسعت پیدا ہوئی اور یہاں ساری مخلوق مراد ہے، جس میں فرشتے، جن وانس، حیوانات، نباتات، جمادات وغیرہ سب شامل ہو گئے۔ (حافظ احمد یار صاحب)۔ (آیت۔8) یَسَّرَ، باب تفعیل، میں جس چیز کو آسان کرتے ہیں وہ مفعول بنفسہٖ آتا ہے اور جس کے لیے آسان کرتے ہیں اس پر لام کا صلہ آتا ہے۔ یہاں نُیَسِّرُ کا مفعول ضمیر مفعولی كَ ہے۔ ترجمہ اسی لحاظ سے ہوگا۔ یُسۡرٰی صفت ہے۔ اس کا موصوف یہاں محذوف ہے۔ (آیت۔9) ذِکۡرٰی فاعل ہے اور مؤنث ہے اس لیے اس کا فعل نَفَعَتۡ واحد مؤنث ہے۔ (آیت۔11) یَتَجَنَّبُ کی ضمیر مفعولی هَا۔ اَلذِّکۡرٰی کے لیے ہے۔

ترجمہ

سَبِّحِ	اسۡمَ رَبِّكَ الۡاَعۡلَی ۙ﴿۱﴾	الَّذِیۡ خَلَقَ فَسَوّٰی ۙ﴿۲﴾	وَالَّذِیۡ
آپ تسبیح کریں	اپنے اعلیٰ رب کے نام کی	وہ، جس نے پیدا کیا پھر اس نے ٹوک پلک درست کی (اس کی)	اور وہ جس نے

قَدَّرَ	فَهَدٰى ۝٣	وَالَّذِيْٓ اَخْرَجَ الْمَرْعٰى ۝٤	فَجَعَلَهٗ	غُثَآءً اَحْوٰى ۝٥
قدر و قیمت اور قدرت طے کی (اس کی)	پھر اس نے راہ سجھائی (اس کو)	وہ جس نے نکالا چارا	پھر اس نے کر دیا اس کو	سیاہ کوڑا

سَنُقْرِئُكَ	فَلَا تَنْسٰٓى ۝٦	اِلَّا مَا	شَآءَ اللّٰهُ	اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ
ہم پڑھائیں گے آپؐ کو	تو آپؐ نہیں بھولیں گے	سوائے اس کے جو	چاہا اللہ نے	بیشک وہ جانتا ہے نمایاں کرنے کو

وَمَا يَخْفٰى ۝٧	وَنُيَسِّرُكَ	لِلْيُسْرٰى ۝٨	فَذَكِّرْ	اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى ۝٩
اور اس کو جو پوشیدہ ہوتا ہے	اور ہم آسان کریں گے (پہنچائیں گے) آپؐ کو	اُس آسان (طریقت) تک	تو آپؐ نصیحت کریں	اگر نفع دے یہ بڑی نصیحت

سَيَذَّكَّرُ مَنْ	يَّخْشٰى ۝١٠	وَيَتَجَنَّبُهَا	الْاَشْقَى ۝١١	الَّذِيْ يَصْلَى
نصیحت حاصل کرے گا (اس سے) وہ، جو	ڈرتا ہے	اور اجتناب کرے گا اس سے	بڑا بدبخت	وہ، جو گرے گا

النَّارَ الْكُبْرٰى ۝١٢	ثُمَّ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا	وَلَا يَحْيٰى ۝١٣	قَدْ اَفْلَحَ مَنْ	تَزَكّٰى ۝١٤
بڑی آگ میں	پھر نہ وہ مرے گا اس میں	اور نہ جیے گا	اس نے مراد پالی ہے جس نے	پاکیزگی حاصل کی

وَذَكَرَ	اسْمَ رَبِّهٖ	فَصَلّٰى ۝١٥	بَلْ تُؤْثِرُوْنَ	الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝١٦	وَالْاٰخِرَةُ
اور اس نے یاد رکھا	اپنے رب کے نام کو	پھر نماز پڑھی	بلکہ تم لوگ ترجیح دیتے ہو	اس دنیوی زندگی کو	اس حال میں کہ آخرت

خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى ۝١٧	اِنَّ هٰذَا	لَفِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ۝١٨	صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى ۝١٩
بہتر ہے اور باقی رہنے والی ہے	بیشک یہ (بات)	یقیناً پہلے صحیفوں میں ہے	ابراہیمؑ اور موسیٰؑ کے صحیفوں میں

نوٹ:1

لفظ تسبیح میں تنزیہہ کا پہلو غالب ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کو ان تمام باتوں سے پاک اور برتر قرار دینا جو اس کی اعلیٰ شان کے منافی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا صحیح تصور ہی تمام علم و معرفت اور قوت و اعتماد کا سرچشمہ ہے۔ اگر اس میں کوئی خلل پیدا ہو جائے تو انسان صحیح معرفت کی شاہراہ سے ہٹ جاتا ہے۔ اور شیطان کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ تسبیح کی سب سے اعلیٰ شکل تو نماز ہے لیکن جس طرح سانس انسان کی مادی زندگی کے لیے ہر وقت ضروری ہے اسی طرح سے اللہ تعالیٰ کی یاد اس کی روحانی زندگی کے لیے ہر وقت ضروری ہے۔ اس لیے صرف نماز کے اوقات ہی میں نہیں بلکہ زندگی کی دوسری سرگرمیوں کے اندر بھی اللہ تعالیٰ کی یاد سے دل کو آباد رکھنا چاہیے تاکہ شیطان کو اس پر غلبہ پانے کا موقع نہ ملے (تدبر قرآن)

آگے آیات۔ 2 تا 5 میں رَبِّ اَعْلٰی کی صفات کا ذکر ہے جو تخلیق کائنات میں اس کی حکمت بالغہ اور قدرت کاملہ کے مشاہدہ سے متعلق ہیں۔ خلق کے معنی محض صنعت گری کے نہیں بلکہ عدم سے وجود میں لانا بھی ہے۔ دوسری صفت فَسَوّٰی ہے۔ برابر کرنے سے مراد یہ ہے کہ ہر چیز کو جو وجود عطاء فرمایا ہے اس میں اس کی جسامت، شکل وصورت اور اعضاء وغیرہ کی وضع قطع میں ایک خاص تناسب ملحوظ رکھا ہے۔ تیسری چیز سلسلہ میں فرمائی قَدَّرَ، جس کے معنی ہر چیز کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فیصلہ اور خاص تجویز کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کی چیزوں کو پیدا کر کے چھوڑ نہیں دیا بلکہ ہر چیز کو کسی خاص کام کے لیے پیدا کیا اور اس کے مناسب اس کو وسائل دیئے اور اسی کام میں اس کو لگا دیا۔ غور کیا جائے تو یہ بات کسی خاص جنس یا نوع مخلوق کے لیے مخصوص نہیں۔ ساری کائنات کی مخلوقات ایسی ہیں کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے خاص خاص کاموں کے

لیے بنایا ہے اور ہر چیز اپنے رب کی مقرر کردہ ڈیوٹی میں لگی ہوئی ہے۔ چوتھی چیز فرمائی فَهَدٰى ۔یعنی خالق کائنات نے ہر چیز کو جس کام کے لیے پیدا فرمایا اس کو اس کی ہدایت بھی فرما دی کہ وہ کس طرح اس کام کو انجام دے۔ یہ ہدایت تمام کائنات کی مخلوقات کو شامل ہے۔ کیونکہ ایک خاص قسم کی عقل وشعور اللہ تعالیٰ نے ان سب کو دیا ہے، گو وہ انسان کے عقل وشعور سے کم ہو۔

انسان کو حق تعالیٰ نے عقل وشعور سب سے زیادہ عطا فرمایا ہے۔ اور زمین میں پیدا ہونے والی اشیاء انسان کی خدمت اور اس کے نفع کے لیے پیدا ہوئی ہیں۔ مگر ان سے فائدہ اٹھانا مختلف قسم کے منافع حاصل کرنا اور مختلف چیزوں کو جوڑ کر ایک نئی چیز پیدا کر لینا، بڑے علم وہنر کا تقاضہ کرتا ہے۔ قدرت نے انسان کے اندر فطری طور پر عقل وفہم ودیعت کر رکھا ہے۔ اور یہ علم وہنر فلاسفہ کی تحقیقات اور کالجوں کی تعلیمات پر موقوف نہیں، بلکہ دنیا کی ابتدا سے اَن پڑھ جاہل یہ سب کام کرتے ہیں۔ یہی فطری سائنس ہے جو حق تعالیٰ نے انسان کو فطرتاً بخشی ہے۔ پھر فنی اور علمی تحقیقات کے ذریعہ اس میں ترقی کرنے کی استعداد بھی اسی قدرت ربانی کا عطیہ ہے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ سائنس کسی چیز کو پیدا نہیں کرتی، بلکہ قدرت کی پیدا کردہ اشیاء کا استعمال سکھاتی ہے۔ اس استعمال کا ادنیٰ درجہ تو حق تعالیٰ نے انسان کو فطرۃً سکھا دیا۔ آگے اس میں فنی تحقیقات اور ترقی کا بڑا وسیع میدان رکھا ہے اور انسان کی فطرت میں اس کو سمجھنے کی استعداد وصلاحیت رکھی ہے جس کے مظاہر اس سائنسی دور میں نت نئے سامنے آرہے ہیں اور معلوم نہیں آگے اس سے زیادہ کیا کیا سامنے آئے گا۔ غور کرو تو یہ سب قرآن کے ایک لفظ فَهَدٰى کی شرح ہے (معارف القرآن)

نوٹ:2

آیت نمبر۔6۔ کے یہ الفاظ کہ ''ہم تمہیں پڑھوا دیں گے پھر تم نہیں بھولو گے'' یہ بتاتے ہیں کہ یہ سورہ اس زمانے میں نازل ہوئی تھی جب رسول اللہ ﷺ کو ابھی وحی اخذ کرنے کی اچھی طرح مشق نہیں ہوئی تھی اور نزول وحی کے وقت آپ کو اندیشہ ہوتا تھا کہ کہیں اس کے الفاظ بھول نہ جائیں۔ اس آیت کے ساتھ سورۂ طٰہٰ کی آیت 114۔ اور سورۂ قیامہ کی آیات۔16 تا19۔ کو ملا کر دیکھا جائے تو واقعات کی ترتیب معلوم ہوتی ہے کہ سب سے پہلے اس سورہ میں حضورؐ کو اطمینان دلا دیا گیا کہ ہم یہ کلام آپ کو پڑھوا دیں گے اور آپؐ اسے نہ بھولیں گے۔ پھر ایک مدت کے بعد جب سورہ قیامہ نازل ہو رہی تھی تو حضور ﷺ بے اختیار وحی کے الفاظ کو دہرانے لگے۔ اس وقت فرمایا گیا کہ وحی کو جلدی یاد کرنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دیں۔ اس کو یاد کرا دینا، پڑھوا دینا پھر اس کا مطلب سمجھا دینا ہمارے ذمہ ہے۔ آخری مرتبہ سورۂ طٰہٰ کے نزول کے موقعہ پر آپؐ کو اندیشہ لاحق ہوا کہ یہ 113۔ آیتیں جو متواتر نازل ہو رہی ہیں ان میں سے کچھ میرے حافظے سے نکل نہ جائے اور آپؐ ان کو یاد کرنے کی کوشش کرنے لگے اس پر فرمایا گیا کہ قرآن پڑھنے میں جلدی نہ کیا کریں جب تک آپؐ کی طرف اس کی وحی تکمیل کو نہ پہنچ جائے۔ اس کے بعد پھر کبھی اس کی نوبت نہیں آئی۔ (تفہیم القرآن۔ ج6۔ص۔308)

آگے فرمایا گیا اِلَّا مَا شَاءَ اللّٰهُ۔ اس فقرے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ پورے قرآن کا لفظ بلفظ آپؐ کے حافظے میں محفوظ ہو جانا آپؐ کی اپنی قوت کا کرشمہ نہیں ہے بلکہ اللہ کے فضل اور اس کی توفیق کا نتیجہ ہے، ورنہ اللہ چاہے تو اسے بھلا سکتا ہے۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کبھی وقتی طور پر آپؐ کو نسیان لاحق ہو جانا اور آپؐ کا کسی آیت یا لفظ کو کسی وقت بھول جانا اس وعدے سے مستثنیٰ ہے۔ وعدہ جس بات کا کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ آپؐ مستقل طور پر قرآن کے کسی لفظ کو نہیں بھول جائیں گے۔ اس مفہوم کی تائید بخاری کی اس روایت سے ہوتی ہے کہ ایک مرتبہ صبح کی نماز پڑھاتے ہوئے رسول اللہؐ قرأت کے دوران میں ایک آیت چھوڑ گئے۔ نماز کے بعد حضرت اُبی بن کعبؓ نے پوچھا کہ کیا یہ آیت منسوخ ہو چکی ہے۔ آپؐ نے فرمایا نہیں میں بھول گیا تھا۔ (تفہیم القرآن)

نوٹ:3

آیت۔8۔کالفظی ترجمہ یہ ہے کہ ہم آپؐ کوطریقہ یُسْرٰی کے لیے آسان کردیں گے۔اس مقام کا تقاضہ یہ تھا کہ فرمایا جاتا ہے کہ ہم اس طریقہ اور شریعت کو آپؐ کے لیے آسان کردیں گے لیکن قرآن کریم نے اس کو چھوڑ کر یہ فرمایا کہ ہم آپؐ کو اس طریقہ کے لیے آسان کردیں گے۔اس میں یہ بتادینا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو طبعی طور پر اور مادی طور پر ایسا بنادیں گے کہ شریعت آپ کی طبعیت بن جائے اور آپؐ شریعت کے سانچے میں ڈھل جائیں۔(معارف القرآن)

عام طور پر مفسرین نے ان دوفقروں (آیات۔8۔9) کو الگ الگ سمجھا ہے۔لیکن ہمارے نزدیک فَذَكِّرْ کا لفظ دونوں فقروں کو باہم مربوط کرتا ہے۔اور بعد کے فقروں کا مضمون پہلے فقرے کے مضمون پر مرتب ہوتا ہے۔اس لیے ہم اس ارشاد الٰہی کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ اے نبیؐ ہم تبلیغ دین کے معاملہ میں آپؐ کو کسی مشکل میں ڈالنا چاہتے کہ تم بہروں کو سناؤ اور اندھوں کو راہ دکھاؤ بلکہ ایک آسان طریقہ تمہارے لیے میسر کیے دیتے ہیں اور وہ یہ نصیحت کرو جہاں تمہیں یہ محسوس ہو کہ کوئی اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے تیار ہے۔اب رہی یہ بات کہ کون فائدہ اٹھانے کے لیے تیار ہے،تو ظاہر ہے کہ اس کا پتہ تبلیغ عام ہی سے چل سکتا ہے۔اس لیے عام تبلیغ تو جاری رکھنی چاہیے مگر اس سے مقصود یہ ہونا چاہیے کہ ان لوگوں کو تلاش کرو جو اس سے فائدہ اٹھا کر راہ راست اختیار کرنا چاہیں۔انہی کی تعلیم وتربیت پر توجہ صرف کرنا چاہیے۔

نوٹ:4

آیت۔13۔کا مطلب ہے کہ نہ اسے موت ہی آئے گی کہ عذاب سے چھوٹ جائے اور نہ جینے کی طرح جیئے گا کہ زندگی کا کوئی لطف اسے حاصل ہو۔یہ سزا ان لوگوں کے لیے ہے جو سرے سے اللہ اور اس کے رسول کی نصیحت کو قبول نہ کریں اور مرتے دم تک کفر وشرک یا دہریت پر قائم رہیں۔رہے وہ لوگ جو دل میں ایمان رکھتے ہوں مگر اپنے برے اعمال کی بنا پر جہنم میں ڈالے جائیں تو ان کے متعلق احادیث میں آیا ہے کہ جب وہ اپنی سزا بھگت لیں گے تو اللہ تعالیٰ انہیں موت دے گا۔پھر ان کے حق میں شفاعت قبول کی جائے گی اور ان کی جلی ہوئی لاشیں جنت کی نہروں پر لاکر ڈالی جائیں گی اور اہل جنت سے کہا جائے گا کہ ان پر پانی ڈالو اس پانی سے وہ اس طرح جی اٹھیں گے جیسے نباتات پانی پڑنے سے اُگ آتی ہیں۔(تفہیم القرآن)

نوٹ:5

حضرت موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کے دوسرے متعدد نبیوں کے صحیفے اسفارِ تورات کی شکل میں موجود ہیں۔ان میں اگرچہ بہت سی تحریفیں ہوچکی ہیں اور ان کی حیثیت تاریخ کی کتابوں سے زیادہ نہیں ہے،تاہم ان سب میں توحید اور قیامت کی تعلیم نہایت واضح اور مؤثر الفاظ میں اتنی کثرت سے موجود ہے کہ جس صحیفے کو بھی پڑھیے ایمان تازہ ہوجاتا ہے۔حضرت ابراہیمؑ نے اپنی اولاد کو جو تعلیم دی تھی،اگرچہ وہ صحیفے کی شکل میں نہیں تھی بلکہ زبانی تعلیم وتلقین کی صورت میں تھی۔ان کی ذریت کی ایک شاخ یعنی بنی اسرائیل نے اس کو اپنے صحیفوں میں بشکل تحریر محفوظ کیا اور ان کے انبیاؑ اپنے اپنے دور میں برابر اس کی یاددہانی کرتے رہے،جس کی ناقابل تردید شہادت آج بھی ان کے صحیفوں میں موجود ہے۔اور قرآن نے بھی جابجا اس کا حوالہ دیا ہے۔آپؑ کی ذریت کی دوسری شاخ بنی۔اسمٰعیل نے اس کو تحریری شکل میں محفوظ نہیں کیا۔انہوں نے روایات کی صورت میں اس کو کچھ مدت تک باقی رکھا پھر اس پر رفتہ رفتہ ذہول کا پردہ پڑ گیا۔پھر نبی ﷺ کی بعثت سے اس کی تجدید اور تکمیل ہوئی۔(تدبر قرآن)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ 2004

سورۃ الغاشیۃ (88)

آیت نمبر (1 تا 16)

ترکیب

(آیت۔2۔3) وُجُوۡہٌ حالانکہ نکرہ ہے لیکن یہاں یہ مبتدا ہے۔ مفہوم کی ادائیگی کے تقاضے کے تحت اس کو معرفہ کے بجائے نکرہ لایا گیا ہے۔ خَاشِعَةٌ کی خبر ہے۔ آگے عَامِلَةٌ اور نَاصِبَةٌ کو بھی اگر اس کی خبر مانیں تو مفہوم بنتا ہے کہ کچھ چہرے اس دن عاجزی کرنے والے ہیں، عمل کرنے والے ہیں، محنت کرنے والے ہیں یہ مفہوم خلاف واقعہ ہے۔ اور اگر عَامِلَةٌ اور نَاصِبَةٌ کو وُجُوۡہٌ کی صفت مانیں تو پھر مفہوم بنتا ہے کہ کچھ عمل کرنے والے محنت کرنے والے چہرے اس دن عاجزی کرنے والے ہیں۔ اور یہی مفہوم حضرت عمرؓ سے منقول ہے۔ (دیکھیں معارف القرآن)۔ (آیت۔4۔5) تَصۡلٰی اور تُسۡقٰی واحد مؤنث کے صیغے ہیں۔ وَجُوۡہٌ جمع مکسر ہے، اس لیے لفظی رعایت کے تحت واحد مؤنث صیغے آئے ہیں۔ تُسۡقٰی، ثلاثی مجرد اور باب افعال، دونوں کا مجہول ہوسکتا ہے کیونکہ دونوں کے مضارع مجہول ہم شکل ہو جاتے ہیں۔ اگر ثلاثی مجرد سے مانیں تو مطلب ہوگا، ان کو پلایا جائے گا۔ اگر باب افعال سے مانیں تو مطلب ہوگا انہیں پینے کو دیا جائے گا۔ (آیت۔6) وُجُوۡہٌ کی لفظی رعایت کے تحت لَیۡسَ لَھَا آنا چاہیے تھا لیکن یہاں معنوی رعایت کی گئی ہے اس لیے لَھُمۡ آیا ہے۔ (آیت۔11) لَاغِیَةً اسم الفاعل کے وزن پر صفت ہے۔ اس کا موصوف محذوف ہے جو کَلِمَةً ہوسکتا ہے۔ (آیت۔12 تا 16) اِن آیات میں عَیۡنٌ جَارِیَةٌ۔ سُرُرٌ مَّرۡفُوۡعَةٌ۔ اَکۡوَابٌ مَّوۡضُوۡعَةٌ۔ نَمَارِقُ مَصۡفُوۡفَةٌ۔ زَرَابِیُّ مَبۡثُوۡثَةٌ۔ یہ سب مبتدا مؤخر نکرہ ہیں اور ان کی خبریں محذوف ہیں۔ آیت۔12۔13۔ میں متعلق خبر فِیۡھَا آیا ہے۔ آگے اس کو محذوف کر دیا گیا ہے۔

ترجمہ

هَلۡ اَتٰىكَ	حَدِیۡثُ الۡغَاشِیَةِ ۘ﴿۱﴾	وُجُوۡهٌ یَّوۡمَئِذٍ	خَاشِعَةٌ ۙ﴿۲﴾
کیا پہنچی آپؐ کے پاس	اُس چھا جانے والی (قیامت) کی بات	کچھ چہرے (کچھ لوگ) اُس دن	عاجزی کرنے والے ہیں

عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ۙ﴿۳﴾	تَصۡلٰی نَارًا حَامِیَةً ۙ﴿۴﴾	تُسۡقٰی	مِنۡ عَیۡنٍ اٰنِیَةٍ ؕ﴿۵﴾
جو عمل کرنے والے محنت کرنے والے تھے	وہ گریں گے ایک دہکنے والی آگ میں	انھیں پینے کو دیا جائے گا	ایک انتہائی (گرم) چشمے سے

لَیۡسَ لَهُمۡ طَعَامٌ	اِلَّا مِنۡ ضَرِیۡعٍ ۙ﴿۶﴾	لَّا یُسۡمِنُ	وَلَا یُغۡنِیۡ	مِنۡ جُوۡعٍ ؕ﴿۷﴾
نہیں ہوگا ان کے لیے کوئی کھانا	مگر ایک خاردار درخت سے	وہ موٹا نہیں کرے گا	اور نہ وہ بے نیاز کرے گا	بھوک سے

وُجُوۡهٌ یَّوۡمَئِذٍ	نَّاعِمَةٌ ۙ﴿۸﴾	لِّسَعۡیِهَا	رَاضِیَةٌ ۙ﴿۹﴾
کچھ چہرے (لوگ) اُس دن	تروتازہ ہونے والے ہیں	اپنی کوشش (کے نتیجے) سے	راضی ہونے والے ہیں

فِیۡ جَنَّةٍ عَالِیَةٍ ۙ﴿۱۰﴾	لَّا تَسۡمَعُ فِیۡهَا	لَاغِیَةً ؕ﴿۱۱﴾	فِیۡهَا عَیۡنٌ جَارِیَةٌ ؕ﴿۱۲﴾
(وہ لوگ ہوں گے) ایک اعلیٰ باغ میں	وہ نہیں سنیں گے اس میں	کوئی لایعنی (بات)	اس میں جاری ہونے والے چشمے میں

فِیۡهَا سُرُرٌ مَّرۡفُوۡعَةٌ ۙ﴿۱۳﴾	وَّاَکۡوَابٌ مَّوۡضُوۡعَةٌ ۙ﴿۱۴﴾	وَّنَمَارِقُ مَصۡفُوۡفَةٌ ۙ﴿۱۵﴾	وَّزَرَابِیُّ مَبۡثُوۡثَةٌ ؕ﴿۱۶﴾
اس میں بلند کیے ہوئے تخت ہیں	اور چنے ہوئے جام ہیں	اور قطار بنائے ہوئے قالین ہیں	اور بکھیرے ہوئے گاؤ تکیے ہیں

نوٹ:1

پہلی آیت میں سوال ہے کیا آپ ﷺ کو پہنچی۔ اس انداز میں جو سوال ہوتا ہے وہ جواب طلب کرنے کے لیے نہیں ہوتا بلکہ کسی چیز کی ہیبت یا اس کی عظمت کے اظہار کے لیے ہوتا ہے۔ آگے وُجُوْہٌ سے مراد اگرچہ افراد ہیں لیکن ان کو تعبیر وُجُوْہٌ سے اس لیے کیا ہے کہ ان کی اندرونی کیفیات کو ظاہر کرنا مقصود ہے۔ اور کیفیات کا اظہار سب سے زیادہ نمایاں طریقہ پر چہروں ہی سے ہوتا ہے۔ (تدبر قرآن)

نوٹ:2

آیت۔2۔3 میں کافروں کے چہرے کا ایک حال یہ بتایا ہے کہ وہ خاشعہ ہوں گے۔ خشوع کے معنے جھکنے اور ذلیل ہونے کے ہیں۔ نماز میں خشوع کا یہی مطلب ہے کہ اللہ کے سامنے جھکنے اور ذلت وپستی کے آثار اپنے وجود پر طاری کرے۔ جن لوگوں نے دنیا میں اللہ تعالیٰ کے سامنے خشوع اختیار نہیں کیا، ان کو اس کی سزا قیامت میں یہ ملے گی کہ وہاں ان کے چہروں پر ذلت اور رسوائی چھائی ہوئی ہوگی۔ ان کے چہروں کا دوسرا اور تیسرا حال یہ بیان فرمایا کہ عاملہ اور ناصبہ ہوں گے کفار ومجرمین کا یہ حال کہ وہ عمل اور محنت سے تھکے اور درماندہ ہوں گے، ظاہر ہے کہ ان کی دنیا کا ہے۔ کیونکہ آخرت میں کوئی اور محنت نہیں ہے۔ اسی لیے قرطبی وغیرہ مفسرین نے اس کا یہ مفہوم قرار دیا ہے کہ خاشعہ کا حال تو آخرت میں ہوگا، جبکہ عاملہ اور ناصبہ کے دونوں حال ان لوگوں کے دنیا ہی میں ہوتے ہیں۔ بہت سے کفار اور فجار مشرکانہ عبادت اور باطل طریقوں سے مجاہدہ اور ریاضت دنیا میں کرتے رہتے ہیں۔ ہندوؤں کے جوگی اور نصاریٰ کے راہب وغیرہ کے علاوہ بہت سے ایسے بھی ہیں جو اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ ہی کی رضا جوئی کے لیے دنیا میں عبادت وریاضت کرتے ہیں اور اس میں محنت شاقہ برداشت کرتے ہیں مگر وہ عبادات مشرکانہ اور باطل طریقہ پر ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی اجر وثواب نہیں رکھتی۔ (عبدالدینار اور عبدالدرہم قسم کے لوگ بھی عبادت میں نہیں بلکہ دنیا میں اپنی روزی کمانے کے لیے اللہ پر توکل اور قناعت کرنے والوں سے کئی گنا زیادہ محنت ومشقت کرتے ہیں، چاہے نماز پڑھتے ہوں، چاہے روزے رکھتے ہوں۔ اللہ کی رحمت سے امید ہے کہ ان کے نماز روزے انھیں خاشعہ سے بچالیں گے، لیکن عاملہ ناصبہ کی سزا تو نقد ہے۔ یہ لوگ دنیا تو خوب کماتے ہیں لیکن دنیا کے حقیقی لطف وسرور سے بلعموم محروم چلے جاتے ہیں۔ اِلَّا مَا شَاءَ اللّٰہ۔ مرتب)۔

حضرت حسن بصریؒ نے روایت کیا ہے کہ حضرت عمرؓ جب ملک شام میں تشریف لے گئے تو ایک نصرانی راہب ان کے پاس آیا جو اپنے مذہب کی عبادت وریاضت میں لگا ہوا تھا۔ محنت سے اس کا چہرہ بگڑا ہوا، بدن خشک اور لباس خستہ تھا۔ جب حضرت عمرؓ نے اس کو دیکھا تو آپ رو پڑے۔ لوگوں نے سبب پوچھا تو آپؓ نے فرمایا کہ مجھے اس کے حال پر رحم آ گیا کہ اس بیچارے نے رضائے الٰہی کے لیے بڑی محنت کی مگر وہ اس کو نہیں پاسکا۔ اور حضرت عمرؓ نے یہی آیات۔2۔3۔ تلاوت فرمائیں۔ (معارف القرآن)

نوٹ:3

قرآن مجید میں کہیں فرمایا گیا ہے کہ جہنم کے لوگوں کو زقوم کھانے کے لیے دیا جائے گا۔ کہیں ارشاد ہوا ہے کہ ان کے لیے غسلین کے سوا کوئی کھانا نہیں ہوگا۔ اور یہاں فرمایا جارہا ہے کہ انھیں خاردار سوکھی گھاس کے سوا کچھ نہ ملے گا۔ ان بیانات میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ ان کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جہنم کے بہت سے درجے ہوں گے جن میں مختلف قسم کے مجرمین اپنے جرائم کے لحاظ سے ڈالے جائیں گے اور مختلف قسم کے عذاب ان کو دیئے جائیں گے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ زقوم کھانے سے بچنا چاہیں گے تو غسلین ان کو ملے گا اس سے بھی بچنا چاہیں گے تو خاردار گھاس کے سوا کچھ نہ پائیں گے۔ (تفہیم القرآن)

نوٹ:4

اہل دوزخ کے متعلق قرآن میں یہ بات جگہ جگہ بیان ہوئی ہے کہ دوزخ کے باڑے میں پہنچتے ہی وہ ایک دوسرے پر لعنت کریں گے کہ فلاں نے ہم کو گمراہ کیا۔ وہ گمراہ نہ کرتا تو ہم ہدایت پر ہوتے۔ لیڈروں اور ان کی پیروی کرنے والوں میں تو تکار ہوگی۔ اپنے اپنے پیروں اور لیڈروں کے لیے وہ لوگ دونے عذاب کا مطالبہ کریں گے۔ لیڈر جواب دیں گے کہ تم نے خود اپنی شامت بلائی کہ جان بوجھ کر ہماری پیروی

کی۔اس کے برعکس اہل جنت کا یہ حال بیان ہوا ہے کہ وہ جنت میں داخل ہونے کے بعد ایک فتح مند ٹیم کی طرح ایک دوسرے کا خیر مقدم تحیت و سلام سے کریں گے۔آپس میں مبارکہ سلامت کے تبادلے ہوں گے۔نہایت خوشگوار موڈ میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھیں گے اور ان کی مجلس محبت واخلاص کی عطر بیزیوں سے معمور ہوگی۔(تدبر قرآن)

آیت نمبر (17 تا 26)

س ط ح

(ف) سَطَحَا بچھانا۔ہموار کرنا۔زیر مطالعہ آیت۔20۔

ترکیب

(آیات۔17۔تا20) میں تمام افعال واحد مونث آئے ہیں۔اس کی وجہ سمجھ لیں۔اَلْاِبِلِ اسم جنس ہے جس میں تمام اونٹ اور اونٹنیاں شامل ہیں۔اس طرح یہ اسم جمع کے حکم میں ہے جس کے لیے فعل واحد مذکر یا واحد مونث، دونوں میں سے کسی طرح لانا جائز ہوتا ہے۔(دیکھیں آسان عربی گرامر، حصہ دوم، پیرا گراف: ۳۱:۴) اَلسَّمَاءِ اور اَلْاَرْضِ، دونوں مؤنث سماعی ہیں، جبکہ اَلْجِبَالِ غیر عاقل کی جمع مکسر ہے اَلسَّمَاءِ اور اَلْجِبَالِ پر لام جنس ہے جبکہ اَلْاَرْضِ پر لام تعریف ہے۔(آیت۔23) اِلَّا سے استثناء کا تعلق سابقہ آیت میں مُصَيْطِرٍ سے نہیں ہے بلکہ اس سے بھی پہلے کی آیت میں فَذَكِّرْ سے ہے۔مفہوم یہ ہے کہ آپ ﷺ نصیحت کرتے رہیں سوائے اس کے جو منہ موڑے اور انکار کرے، کیونکہ آپ نصیحت کرنے والے ہیں، داروغہ نہیں ہیں۔

ترجمہ

اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ	كَيْفَ خُلِقَتْ ﴿۱۷﴾	وَاِلَى السَّمَآءِ	كَيْفَ رُفِعَتْ ﴿۱۸﴾
تو کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں اونٹوں کی طرف	(کہ) کیسا اس کو بنایا گیا	اور آسمانوں کی طرف	(کہ) کیسا ان کو بلند کیا گیا

وَاِلَى الْجِبَالِ	كَيْفَ نُصِبَتْ ﴿۱۹﴾	وَاِلَى الْاَرْضِ	كَيْفَ سُطِحَتْ ﴿۲۰﴾
اور پہاڑوں کی طرف	(کہ) کیسا ان کو گاڑا گیا	اور اس زمین کی طرف	(کہ) کیسا اس کو بچھایا گیا

فَذَكِّرْ ﴿۲۱﴾	اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ ﴿۲۲﴾	لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ﴿۲۳﴾
تو آپ نصیحت کرتے رہیں	آپ تو بس نصیحت کرنے والے ہیں	اُن پر کوئی داروغہ نہیں ہیں

اِلَّا مَنْ تَوَلّٰى وَكَفَرَ ﴿۲۴﴾	فَيُعَذِّبُهُ اللّٰهُ
(اس لیے نصیحت کرتے ہیں) سوائے اس کے جس نے منہ موڑا اور (سننے سے ہی) انکار کیا	تو ان کو عذاب دے گا اللہ

الْعَذَابَ الْاَكْبَرَ ﴿۲۴﴾	اِنَّ اِلَيْنَآ	اِيَابَهُمْ ﴿۲۵﴾	ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا	حِسَابَهُمْ ﴿۲۶﴾
وہ بڑا (دوزخ کا) عذاب	یقیناً ہماری طرف ہی	ان کی واپسی ہے	پھر یقیناً ہم پر ہی ہے	ان سے حساب لینا

نوٹ: 1

آیات۔17 تا 20 کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہ لوگ آخرت کی باتیں سن کر کہتے ہیں کہ آخر یہ سب کچھ کیسے ہوسکتا ہے تو کیا اپنے گرد و پیش کی دنیا پر نظر ڈال کر انہوں نے کبھی نہ سوچا کہ یہ اونٹ کیسے بن گئے۔آسمان کیسے بلند ہوگیا۔پہاڑ کیسے قائم ہوگئے، زمین کیسے بچھ گئی۔یہ ساری چیزیں اگر بن سکتی ہیں اور بنی بنائی ان کے سامنے موجود ہیں تو آخرت میں ایک دوسری دنیا کیوں نہیں بن سکتی۔جنت اور دوزخ کیوں نہیں ہو سکتیں۔(تفہیم القرآن)

کائنات کی بے شمار چیزوں میں سے ان چار چیزوں کی تخصیص بقول ابن کثیرؒ اس لیے ہے کہ عرب کے لوگ اکثر جنگلوں میں چلتے پھرتے تھے۔اس وقت ان کے سامنے یہی چار چیزیں ہوتی تھیں۔سواری میں اونٹ، اوپر آسمان، نیچے زمین اور ارد گرد پہاڑ۔اس لیے ان ہی علامات میں غور کرنے کے لیے ارشاد ہوا۔(ترجمہ شیخ الہندؒ)

ان میں سے دونشانیاں، اونٹ اور زمین، ربوبیت کے پہلو سے اور دونشانیاں، آسمان اور پہاڑ، خالق کی قدرت وحکمت کے پہلو سے زیادہ نمایاں ہیں۔خالق کی انہی صفات پر قیامت اور جزاء وسزا کے پورے پہلو کی بنیاد ہے۔(تدبر قرآن)

نوٹ:2

جانوروں میں اونٹ کی کچھ ایسی خصوصیات بھی ہیں جو غور کرنے والے کے لیے اللہ تعالیٰ کی حکمت وقدرت کا آئینہ بن سکتی ہیں۔اول تو عرب میں ڈیل ڈول کے اعتبار سے سب سے بڑا جانور اونٹ ہی ہے، ہاتھی وہاں ہوتا نہیں۔دوسرے اللہ تعالیٰ نے اس عظیم جانور کو ایسا بنا دیا کہ عرب کے بدو اور مفلس آدمی بھی اتنے بڑے جانور کو پالنے اور رکھنے میں کوئی مشکل محسوس نہ کریں، کیونکہ اس کو چھوڑ دیں تو یہ اپنا پیٹ خود بھر لیتا ہے۔ اونچے درختوں کے پتے توڑنے کی زحمت بھی آپ کو نہیں کرنا پڑتی یہ خود درختوں کی شاخیں کھا کر گزارہ کر لیتا ہے۔اس کی خوراک ہاتھی اور دوسرے جانوروں کی طرح نہیں جو بہت مہنگی پڑتی ہے۔عرب میں پانی ایک بہت کمیاب چیز ہے، ہر جگہ ہر وقت نہیں ملتا۔قدرت نے اس کے پیٹ میں ایک ریزرو ٹنکی ایسی لگا دی ہے کہ سات آٹھ روز کا پانی وہ اس ٹنکی میں محفوظ کر لیتا ہے اور تدریجی رفتار سے وہ اپنی پانی کی ضرورت کو پورا کرتا رہتا ہے۔اتنے اونچے جانور پر سوار ہونے کے لیے سیڑھی لگانی پڑتی مگر قدرت نے اس کے پاؤں کو تین تہہ میں تقسیم کر دیا یعنی ہر پاؤں میں دو گھٹنے بنا دیئے، جسے وہ طے کر کے بیٹھ جاتا ہے تو اس پر چڑھنا اور اترنا آسان ہو جاتا ہے۔محنت کش اتنا کہ سب جانوروں سے زیادہ بوجھ اٹھا لیتا ہے۔عرب کے میدانوں میں دھوپ کی وجہ سے دن کا سفر سخت مشکل ہے۔قدرت نے اس کو رات بھر چلنے کا عادی بنا دیا۔مسکین طبع ایسا ہے کہ ایک بچی اس کی مہار پکڑ کر جہاں چاہے لے جائے۔اس کے علاوہ اور بھی بہت سی خصوصیات میں جو انسان کو اللہ تعالیٰ کی قدرت اور حکمت بالغہ کا سبق دیتی ہیں۔(معارف القرآن)

یہ واحد جانور ہے کہ اس کو بیٹھا کر اس کی پیٹھ پر بوجھ لادیں، پھر اس کو کھڑا کریں تو یہ بوجھ سمیت اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔کسی دوسرے جانور میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ وہ پیٹھ پر بوجھ لاد کر بیٹھے سے اٹھ کھڑا ہو۔کہتے ہیں کہ کسی شخص نے اپنی ایک دانا بزرگ کو بتایا کہ میں نے ایک ایسا جانور دیکھا ہے جو بوجھ لاد کر اٹھ کھڑا ہو جاتا ہے۔تو بزرگ نے فرمایا کہ اگر ایسا ہے تو اس کی گردن ضرور لمبی ہوگی۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید اونٹ کی گردن بوجھ اٹھانے کے لیے لیور کا کام دیتی ہے۔(حافظ احمد یار صاحب)

نوٹ:3

اب آیت۔21۔اور اس سے آگے نبی ﷺ کو تسلی دی گئی ہے کہ جو لوگ آپ ﷺ کے انذار کو جھٹلا رہے ہیں وہ اس وجہ سے نہیں جھٹلا رہے ہیں کہ اس انذار کے حق میں دلائل نہیں ہیں۔دلائل تو آسمان سے لے کر زمین تک چپہ چپہ پر ہیں لیکن ان سے فائدہ ہی اٹھاتے ہیں کہ جن کے اندر خشیت ہوتی ہے۔رہے وہ لوگ جن کے دلوں پر قساوت چھا چکی ہے وہ ان نشانیوں سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔اس لیے آپ ﷺ ان کے رد وقبول سے بے نیاز ہو کر اپنی تذکیر و تبلیغ ہی ہے۔آپ ﷺ پر یہ ذمہ داری نہیں ہے آپ ان کے دلوں میں ایمان اتار ہی دیں۔ اللہ نے آپ کو یاددہانی کرنے والا بنا کر بھیجا ہے، ان کے ایمان نہ لانے کی پرسش آپ ﷺ سے ہو(تدبر قرآن)

2004

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ الفجر (89)

آیت نمبر (1 تا 14)

ترکیب

(آیت۔2) لَیَالٍ دراصل لَیَالِیٌ ہے جو قاعدہ کے مطابق تبدیل ہو کر لَیَالٍ لکھی جاتی ہے۔ (آیت۔4) یَسۡرِ مادہ ''ی س ر'' سے نہیں ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر یہ اس کا ماضی ہوتا تو یَسَرَ یا یَسُرَ ہوتا یَیۡسِرُ یا یَیۡسُرُ ہوتا، کیونکہ یہ باب ضَرَبَ اور کَرُمَ دونوں سے آتا ہے۔ یہاں یَسۡرِ میں سین پر علامت سکون اور را کی کسرہ بتا رہی ہے کہ یہ مادہ ''س ری'' کا مضارع یَسۡرِیُ ہے، جس کی یا گری ہوئی ہے۔ (آیت۔7) قبیلہ عاد دو تھے۔ عادِ اولیٰ کا دوسرا نام اِرَمُ (غیر منصرف) ہے۔ یہاں یہ عَادٍ کے بدل کے طور پر آیا ہے اس لیے اِرَمَ حالت جَر میں ہے۔ذَاتِ الۡعِمَادِ اِرَمَ کی صفت ہے اس لیے ذَاتِ حالت جر میں آیا ہے۔اور عَادٍ ایک قبیلہ ہے اس لیے ذَاتِ مؤنث کا صیغہ آیا۔ (آیت۔8) لَمۡ یُخۡلَقۡ کا نائب فاعل ہونے کی وجہ سے مِثۡلُهَا میں مِثۡلُ حالت رفع میں آیا ہے۔ (آیات۔9۔10) ثَمُوۡدَ اور فِرۡعَوۡنَ، یہ دونوں لِعَادٍ کی بِ پر عطف ہونے کی وجہ سے حالت جَرّ میں ہیں۔ (آیت۔11) اَلَّذِیۡنَ جمع کا صیغہ بتا رہا ہے کہ یہ عاد، ثمود اور فرعون تینوں کے لیے ہے۔

ترجمہ

وَالۡفَجۡرِ ۙ﴿۱﴾	وَلَیَالٍ عَشۡرٍ ۙ﴿۲﴾	وَّالشَّفۡعِ	وَالۡوَتۡرِ ۙ﴿۳﴾	وَالَّیۡلِ	اِذَا یَسۡرِ ۚ﴿۴﴾
قسم ہے فجر کی	اور قسم ہے دس راتوں کی	اور قسم ہے جفت کی	اور قسم ہے طاق کی	اور قسم ہے رات کی	جب وہ چلتی (ڈھلتی) ہے

هَلۡ فِیۡ ذٰلِكَ قَسَمٌ	لِّذِیۡ حِجۡرٍ ؕ﴿۵﴾	اَلَمۡ تَرَ	كَیۡفَ فَعَلَ رَبُّكَ	بِعَادٍ ۙ﴿۶﴾
کیا اس میں کوئی قسم ہے	کسی عقل والے کیے لیے	کیا آپؐ نے دیکھا نہیں	(کہ) کیسا کیا آپؐ کے رب نے	عاد کے ساتھ

اِرَمَ	ذَاتِ الۡعِمَادِ ۙ﴿۷﴾	الَّتِیۡ لَمۡ یُخۡلَقۡ	مِثۡلُهَا	فِی الۡبِلَادِ ۙ﴿۸﴾
(یعنی عادِ) ارم کے ساتھ	جو ستونوں والے تھے	وہ، پیدا نہیں کیا گیا	جن کے جیسا	سارے شہروں میں

وَثَمُوۡدَ	الَّذِیۡنَ جَابُوا الصَّخۡرَ	بِالۡوَادِ ۙ﴿۹﴾	وَفِرۡعَوۡنَ	ذِی الۡاَوۡتَادِ ۙ﴿۱۰﴾
اور ثمود کے ساتھ	جنہوں نے تراشیں چٹانیں	اس وادی میں	اور فرعون کے ساتھ	جو میخوں والا تھا

الَّذِیۡنَ طَغَوۡا	فِی الۡبِلَادِ ۙ﴿۱۱﴾	فَاَكۡثَرُوۡا فِیۡهَا	الۡفَسَادَ ۙ﴿۱۲﴾	فَصَبَّ عَلَیۡهِمۡ
وہ لوگ جنہوں نے سرکشی کی	شہروں میں	پھر انہوں نے کثرت دی اُن میں	فساد کو	تو برسایا ان پر

رَبُّكَ سَوۡطَ عَذَابٍ ؕ﴿۱۳﴾	اِنَّ رَبَّكَ	لَبِالۡمِرۡصَادِ ؕ﴿۱۴﴾
آپؐ کے رب نے ایک عذاب کا کوڑا	بیشک آپؐ کا رب	یقیناً گھات میں ہے

نوٹ: 1

یہاں پانچ چیزوں کی قسم کھا کر اس مضمون کی تاکید کی گئی ہے جو آگے اِنَّ رَبَّكَ لَبِالۡمِرۡصَادِ میں بیان ہوا ہے، یعنی اس دنیا میں تم جو کچھ کر رہے ہو اس پر جزاء و سزا ہونا لازمی اور یقینی ہے۔ تمہارا رب تمہارے سب اعمال کی نگرانی میں ہے۔

وہ پانچ چیزیں جن کی قسم کھائی ہے، ان میں پہلی چیز فجر یعنی صبح صادق ہے۔ ہوسکتا ہے اس سے مراد ہر روز کی صبح ہو، کیوں کہ وہ عالم میں ایک انقلاب عظیم لاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ حضرت علیؓ، ابن عباسؓ اور ابن زبیرؓ سے یہی معنی منقول ہے۔ بعض مفسرین نے ذی الحجہ کی دسویں تاریخ یعنی یوم النحر (خون بہانے کا دن) کی صبح کو اس کی مراد قرار دیا ہے۔ مجاہدؒ و عکرمہؒ کا یہی قول ہے۔ اور حضرت ابن عباسؓ سے بھی ایک روایت میں یہ قول منقول ہے۔ اس یوم النحر کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر دن کے ساتھ ایک رات لگائی ہے جو اسلامی اصول کے مطابق دن سے پہلے ہوتی ہے۔ صرف یوم النحر ایک ایسا دن ہے کہ اس کے ساتھ کوئی رات نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یوم النحر سے پہلے جو رات ہے وہ یوم النحر کی نہیں بلکہ شرعاً یوم العرفہ ہی کی رات قرار دی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی حج کرنے والا عرفہ کے دن میدان عرفات میں نہ پہنچ سکا لیکن رات کو صبح صادق سے پہلے کسی وقت بھی عرفات میں پہنچ گیا تو اس کا وقوف معتبر اور حج صحیح ہو جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ روز عرفہ کی دو راتیں ہیں اور یوم النحر کی کوئی رات نہیں۔ اس طرح یوم النحر کی صبح ایک خاص شان رکھتی ہے۔

دوسری قسم دس راتوں کی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ، قتادہؒ، مجاہدؒ، سُدّیؒ، ضحاکؒ، کلبیؒ، ائمہ تفسیر کے نزدیک ذی الحجہ کی ابتدائی دس راتیں اس سے مراد ہیں۔ کیونکہ حدیث میں ان کی بڑی فضیلت آئی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ یہ دس راتیں وہ ہی ہیں جو حضرت موسیٰؑ کے قصے میں آئی ہیں۔ امام قرطبیؒ نے فرمایا کہ حضرت موسیٰؑ کے لیے بھی یہی دس راتیں ذی الحجہ کی مقرر کی گئی تھیں۔

وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ ۔قران کریم کے الفاظ سے یہ متعین نہیں کہ اس جفت اور طاق سے کیا مراد ہے۔ اس لیے اس میں ائمہ تفسیر کے بے شمار اقوال ہیں۔ ایک مرفوع حدیث میں جسے ابوزبیر نے حضرت جابرؓ سے روایت کیا ہے، یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے **وَالْفَجْرِ وَلَيَالٍ عَشْرٍ** کے متعلق فرمایا کہ فجر سے مراد صبح اور عشر سے مراد عشرۂ نحر ہے۔ اور فرمایا کہ وتر سے مراد روز عرفہ اور شفع سے مراد یوم النحر ہے۔ قرطبیؒ نے اس روایت کو نقل کر کے فرمایا کہ یہ اسناد کے اعتبار سے زیادہ صحیح ہے یہ نسبت دوسری حدیث کے جس میں شفع اور وتر نماز کا ذکر ہے۔ اسی لیے حضرت ابن عباسؓ، عکرمہؒ، نحاسؒ نے اسی کو اختیار کیا کہ شفع سے مراد یوم النحر اور وتر سے مراد یوم عرفہ ہے۔

وَاللَّيْلِ إِذَا يَسْرِ ۔**يَسْرِ** یُ کی معنے رات کو چلنے کے ہیں۔ یہاں خود رات کو کہا گیا کہ جب وہ چلنے لگے یعنی ختم ہونے لگے۔ یہ پانچ قسمیں ذکر فرمانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے انسان کو سوچنے سمجھنے کی دعوت دینے کے لیے فرمایا کہ کیا عقل والے آدمی کے لیے یہ قسمیں کافی ہیں یا نہیں۔ (معارف القرآن ج8۔ص738 تا740 سے ماخوذ)

نوٹ:2

یہاں جو قسمیں کھائی گئی ہیں وہ دعوے پر شہادت کے لیے کھائی گئی ہیں کہ اس کائنات کا مدبر حقیقی اللہ وحدہٗ لاشریک ہے۔ اسی کے ہاتھ میں ہر چیز کی باگ ہے۔ وہی جب چاہتا ہے ایک چیز کو نمودار کرتا ہے اور جب چاہتا ہے اس کو اوجھل کر دیتا ہے۔ وہ جس کو جس حد تک چاہتا ہے ڈھیل دیتا ہے اور جہاں چاہتا ہے روک دیتا ہے۔ مجال نہیں ہے کہ کوئی چیز اپنی مقرر کردہ حد سے آگے بڑھے یا اس کے اختیار میں مداخلت کر سکے (تدبر قرآن۔ج9۔ص346)

ان اضداد سے پہلی دلیل تو قرآن نے توحید پر قائم کی ہے۔ (جیسا کہ اوپر وضاحت کی گئی)۔ اور قرآن نے اس سے دوسری دلیل قیامت پر قائم فرمائی ہے۔ وہ مختصر الفاظ میں یوں ہے کہ اس دنیا میں اس کے خالق نے ہر چیز جوڑے جوڑے پیدا کی ہے۔ اور ہر چیز اپنے جوڑے سے مل کر اپنی غایت کو پہنچتی ہے۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہی حکم اس دنیا پر بھی لگ سکتا ہے۔ اگر اس کے ساتھ آخرت کو نہ ملایئے تو اس کے اندر ایک ایسا خلا رہ جاتا ہے جو آخرت کو مانے بغیر کسی طرح نہیں بھرتا۔ اس میں نیکی اور بدی، عدل اور ظلم میں ہر وقت جو کشمکش برپا ہے اس

کا فطری مطالبہ یہ ہے کہ ایک ایسا روز انصاف آئے جس میں اس کا خالق لوگوں کا محاسبہ کرے۔ پھر اچھے بندوں کو صلہ دے اور بروں کو ان کے کیفرِ کردار کو پہنچا دے۔ تیسری حقیقت یہ واضح فرمائی ہے کہ جس طرح انسان کے مادی وجود کے لیے دن کی روشنی اور حرارت کے ساتھ رات کی تاریکی اور خنکی بھی ضروری ہے، اسی طرح اس کی روحانی اور اخلاقی تربیت کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کو تنگی اور فراخی، صحت اور مرض کی آزمائشوں سے گزارا جائے، تاکہ اس کے صبر اور شکر کی تربیت ہو اور وہ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً کا مقام حاصل کرنے کا اہل بنے۔ چوتھی حقیقت یہ واضح فرمائی کہ کسی کو، خواہ وہ کتنا ہی زور اور اثر رکھنے والا ہو، خدا کی ڈھیل سے اس گھمنڈ میں نہیں پڑنا چاہیے کہ وہ اس کی گرفت سے باہر ہے۔ جب سورج اور چاند، رات اور دن اس کے کنٹرول سے باہر نہیں تو انسان کی کیا حقیقت ہے کہ وہ خود کو اس کے اقتدار سے باہر سمجھے۔ (تدبر قرآن۔ ج9۔ ص351 تا353)

نوٹ: 3 جزاوسزا پر شب وروز کے نظام سے استدلال کرنے کے بعد آیات۔ 6 تا 14۔ میں انسانی تاریخ سے استدلال کیا گیا ہے۔ تاریخ کی چند معروف قوموں کے طرزِ عمل اور ان کے انجام کے ذکر سے یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ کائنات کسی اندھے بہرے قانون فطرت (Law of Nature) پر نہیں چل رہی ہے بلکہ ایک خدائے حکیم اس کو چلا رہا ہے۔ اس خدا کی خدائی میں صرف ایک وہی قانون کارفرما نہیں ہے جسے تم قانون فطرت کہتے ہو۔ بلکہ ایک قانون اخلاق بھی کارفرما ہے جس کا لازمی تقاضا مکافاتِ عمل اور جزاء وسزا ہے۔ اس قانون کی کارفرمائی کے آثار خود اس دنیا میں بھی بار بار ظاہر ہوتے رہے ہیں۔ یہاں جن قوموں نے بھی آخرت سے بے فکر ہو کر اپنی زندگی کا نظام چلایا وہ آخر کار مفسد بن کر رہے اور اس کائنات کے رب نے آخر کار عذاب کا کوڑا برسا دیا۔ انسانی تاریخ کا یہ مسلسل تجربہ دو باتوں کی واضح شہادت دے رہا ہے۔ ایک یہ کہ آخرت کا انکار ہر قوم کو بگاڑنے اور بالآخر تباہی میں دھکیلنے کا موجب ہوا ہے۔ اس لیے آخرت فی الواقع ایک حقیقت ہے جس سے ٹکرانے کا نتیجہ وہی ہوتا ہے جو حقیقت سے ٹکرانے کا ہوا کرتا ہے۔ دوسرے یہ کہ جزائے اعمال کسی وقت مکمل طور پر بھی واقع ہونے والی ہے۔ کیونکہ فساد کی آخری حد پر پہنچ کر عذاب کا کوڑا جن لوگوں پر برسا، ان سے پہلے صدیوں تک بہت سے لوگ اس فساد کے بیج بو کر دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ ان پر کوئی عذاب نہیں آیا تھا۔ خدا کے انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ کسی وقت ان سب کی بھی باز پرس ہو اور وہ بھی سزا پائیں۔ (تفہیم القرآن)

آیت نمبر (15 تا 30)

ج م م

(ن۔ض) جُمُوْمًا کسی چیز کا کثرت سے جمع ہونا۔ (لازم)

جَمًّا کسی چیز کو کثرت سے جمع کرنا۔ (متعدی)، زیر مطالعہ آیت۔ 20۔

ترکیب (آیت۔ 15۔ 16) اِذَا میں غیر معین وقت کا مفہوم ہوتا ہے۔ اس کو مزید غیر معین کرنے کے لیے اس کے ساتھ مَا کا اضافہ کیا گیا ہے۔ (دیکھیں آیت۔ 2/البقرۃ: 11، نوٹ۔ 1۔ آیت۔ 2/البقرۃ: 26، نوٹ۔)۔ (آیت۔ 19۔ 20) تَاْكُلُوْنَ کا مفعول مطلق اَكْلًا ہے اور لَّمًّا حال ہونے کی وجہ سے حالت نصب میں ہے۔ اسی طرح سے تُحِبُّوْنَ، جو باب افعال سے ہے اس کا مفعول مطلق ثلاثی مجرد سے حُبًّا آیا ہے، جبکہ جَمًّا حال ہے۔ (آیت۔ 22) جَآءَ کا فاعل رَبُّكَ بھی ہے اور اَلْمَلَكُ بھی۔ لیکن صَفًّا صَفًّا صرف اَلْمَلَكُ کا حال ہے اور اس پر لام جنس ہے۔ (آیت۔ 25۔ 26) لَا يُعَذِّبُ اور لَا يُوْثِقُ کا فاعل اَحَدٌ ہے۔ عَذَابَهٗ اور وَثَاقَهٗ کی ضمیریں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں۔ (آیت۔ 28)۔ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً یہ دونوں حال ہیں۔

2004

ترجمہ

فَاَمَّا الْاِنْسَانُ	اِذَا مَا	ابْتَلٰىهُ	رَبُّهٗ	فَاَكْرَمَهٗ
پس وہ جو ہے انسان	(تو) جب کبھی بھی	آزمائش میں ڈالتا ہے اس کو	اس کا رب	تو وہ عزت دیتا ہے اس کو

وَنَعَّمَهٗ	فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ	اَكْرَمَنِ (15)	وَاَمَّآ	اِذَا مَا
اور وہ بتدریج نعمت دیتا ہے اس کو	تو وہ (انسان) کہتا ہے میرے رب نے	مہربانی کی مجھ پر	اور وہ جو ہے	(کہ) جب کبھی بھی

ابْتَلٰىهُ	فَقَدَرَ عَلَيْهِ	رِزْقَهٗ	فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ
وہ آزمائش میں ڈالتا ہے اس کو	تو وہ اندازہ (تنگی) کرتا ہے اس پر	اس کے رزق کا	تو وہ کہتا ہے میرے رب نے

اَهَانَنِ (16)	كَلَّا بَلْ	لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ (17)
اہانت کی میری	ہرگز نہیں، بلکہ (بات یہ ہے کہ)	تم لوگ مہربانی نہیں کرتے یتیم پر

وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ	عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ (18)	وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ
اور تم لوگ ایک دوسرے کو ترغیب نہیں دیتے	مسکین کے کھانا (کھلانے) پر	اور تم لوگ کھاتے ہو میت کا مال

اَكْلًا	لَّمًّا (19)	وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ	حُبًّا	جَمًّا (20)
جیسے کھاتے ہیں	سمیٹتے ہوئے	اور تم لوگ محبت کرتے ہو مال سے	جیسا محبت کرنے کا حق ہے	کثرت سے جمع کرتے ہوئے

كَلَّآ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ	دَكًّا دَكًّا (21)	وَّجَآءَ رَبُّكَ	وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا (22)
ہرگز نہیں، جب ہموار کی جائے گی زمین	کوٹ کوٹ کر	اور آئے گا آپ کا رب	اور سارے فرشتے قطار در قطار

وَجِايْٓءَ يَوْمَىِٕذٍۭ بِجَهَنَّمَ	يَوْمَىِٕذٍ يَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ	وَ	اَنّٰى لَهُ
اور (نزدیک) لائی جائے گی اس دن جہنم	(تب) اس دن یاد کرے گا انسان	اس حال میں (کہ)	کہاں ہوگی اس کے لیے

الذِّكْرٰى (23)	يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ قَدَّمْتُ	لِحَيَاتِيْ (24)
وہ بڑی نصیحت	(پھر) وہ کہے گا اے کاش میں نے آگے بھیجا ہوتا	اپنی زندگی کے لیے

فَيَوْمَىِٕذٍ لَّا يُعَذِّبُ	عَذَابَهٗٓ	اَحَدٌ (25)	وَّلَا يُوْثِقُ
تو اس دن عذاب نہیں دے (سکے) گا	اس (اللہ) کے عذاب (جیسا)	کوئی ایک بھی	اور نہیں جکڑے گا

وَثَاقَهٗٓ	اَحَدٌ (26)	يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَىِٕنَّةُ (27)	ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ
اس کا (سا) جکڑنا	کوئی ایک بھی	(پھر کہا جائے گا) اے مطمئن ہونے والی جان	تو واپس چل اپنے رب کی طرف

رَاضِيَةً	مَّرْضِيَّةً (28)	فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ (29)	وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ (30)
راضی ہوتے ہوئے (اپنے رب سے)	پسندیدہ ہوتے ہوئے (اپنے رب کی)	پھر تو داخل (شامل) ہو جا میرے بندوں میں	اور تو داخل ہو جا میری جنت میں

نوٹ: 1 آیات۔15۔16 میں انسان سے مراد اصل میں تو کافر انسان ہے۔ مگر مفہوم عام کے اعتبار سے وہ مسلمان بھی اس خطاب میں شریک ہے جو اس جیسے خیال میں مبتلا ہو۔ اور وہ خیال یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کو اس کے رزق میں وسعت سے نوازے تو شیطان اس کو دو باطل خیالات

میں مبتلا کرتا ہے۔ اول یہ کہ وہ سمجھنے لگتا ہے کہ یہ میری ذاتی صلاحیت، عقل وفہم اور محنت کا نتیجہ ہے جو مجھے ملنا ہی چاہیے۔ دوسرے یہ کہ ان چیزوں کے اصل ہونے سے وہ سمجھ بیٹھے میں اللہ کے نزدیک بھی مقبول ہوں۔ اسی طرح سے جب کسی انسان پر رزق میں تنگی آئے تو اس کو اللہ کے نزدیک مردود ہونے کی دلیل سمجھے۔ ایسے خیالات کفار ومشرکین میں تو ہوتے ہی ہیں، مگر افسوس ہے کہ آج کل بہت سے مسلمان بھی اس گمراہی میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ (معارف القرآن)

اس دنیا میں انسان کو تنگی کی حالت پیش آئے یا فراخی کی، یہ دونوں ہی بطور امتحان پیش آتی ہیں۔ کسی کو فراخی بخشنے سے مقصود اس کے شکر کو جانچنا ہوتا ہے کہ نعمتیں پاکر وہ مغرور بن جاتا ہے یا اپنے رب کا شکر گزار اور اُس کے بندوں کا خدمت گزار بنتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی کا رزق تنگ کرتا ہے تو اس سے مقصود اس کے صبر کا امتحان ہوتا ہے کہ وہ اپنے رب کے فیصلے پر قانع ومطمئن اور اپنے کردار میں پختہ ثابت ہوتا ہے یا حوصلہ ہار دیتا ہے۔ انسان کے صبر وشکر کی پختگی ہی پر اس کے تمام دین کی پختگی کا انحصار ہے، اس لیے ان دونوں چیزوں کا امتحان برابر ہوتا رہتا ہے۔ جس نے اپنے اندر یہ دونوں صفات پیدا کرلیں، اس کو نفس مطمئنہ کی دولت حاصل ہوگئی اور اسی کو اللہ تعالیٰ کے ہاں رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً کی بادشاہی حاصل ہوگی۔ (تدبر قرآن)

نوٹ:2

آیت۔24۔ میں الفاظ ہیں جَاءَ رَبُّكَ۔ ان کا لفظ ترجمہ ہے ''تیرا رب آئے گا''، لیکن ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے اس کو ایک تمثیلی انداز بیان ہی سمجھنا ہوگا۔ جس سے یہ تصور دلانا مقصود ہے کہ اس وقت اللہ تعالیٰ کے اقتدار اور اس کی سلطانی کے آثار اس طرح ظاہر ہوں گے جیسے دنیا میں کسی بادشاہ کے تمام لشکروں کی آمد سے وہ رعب طاری نہیں ہوتا جو بادشاہ کے خود دربار میں آجانے سے طاری ہوتا ہے۔ (تفہیم القرآن)

نوٹ:3

آیات۔25۔26 کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس دن مجرموں کو ایسی سخت سزا دے گا اور ایسی سخت قید میں رکھے گا کہ کسی دوسرے کی طرف سے اس طرح کی سختی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اور شاہ عبدالعزیز لکھتے ہیں کہ ''اس روز نہ مارے گا اس کو سامارنا کوئی، نہ آگ نہ دوزخ کے موکل، نہ سانپ بچھو، جو دوزخ میں ہوں گے۔ کیونکہ ان کا مارنا اور دکھ دینا عذاب جسمانی ہے۔ اور حق تعالیٰ کا عذاب اس طور سے ہوگا کہ مجرم کی روح کو حسرت اور ندامت میں گرفتار کردے گا، جو عذاب روحانی ہے، اور ظاہر ہے کہ عذاب روحانی کو عذاب جسمانی سے کیا نسبت۔ نیز نہ باندھے گا اس کا سا باندھنا کوئی۔ کیونکہ دوزخ کے پیادے ہر چند کو دوزخیوں کے گلے میں طوق ڈالیں گے، زنجیروں سے جکڑیں گے اور دوزخ کے دروازے بند کرکے اوپر سے سرپوش رکھ دیں گے لیکن ان کی عقل اور خیال کو بند نہ کرسکیں گے۔ اور عقل وخیال کی عادت ہے کہ بہت سی باتوں کی طرف التفات کرتا ہے اور ان میں سے بعض باتیں دوسری باتوں کے لیے حجاب ہوجاتی ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ عقل وخیال کو ادھر ادھر جانے سے روک دے گا اور بالکل ہمہ تن دکھ درد ہی کی طرف متوجہ رکھے گا۔ تو ایسی قید بدنی قید سے ہزاروں درجے سخت ہے۔

(ترجمہ شیخ الہندؒ)

نوٹ:4

نفس مطمئن سے مراد انسان ہے جس نے کسی شک وشبہ کے بغیر پورے اطمینان اور ٹھنڈے دل کے ساتھ اللہ وحدہٗ لاشریک کو اپنا رب اور انبیاء کے لائے ہوئے دین کو اپنا دین قرار دیا ہے۔ جو عقیدہ اور جو حکم بھی اللہ اور اس کے رسول سے ملا اسے سراسر حق مانا۔ جس چیز سے بھی اللہ کے دین نے منع کیا اسے بادل ناخواستہ نہیں بلکہ اس یقین کے ساتھ چھوڑا کہ فی الواقع وہ بُری چیز ہے۔ حق پرستی کی راہ میں جس قربانی کی بھی ضرورت پیش کردی۔ جن مشکلات، تکالیف اور مصائب سے بھی اس راہ میں سابقہ پڑا، انہیں پورے سکون قلب کے ساتھ برداشت کیا اور

2004

دوسرے راستوں پر چلنے والوں کو اس دنیا میں جو فوائد منافع اور لذتیں حاصل ہوتی ہیں ان سے محروم رہ جانے پر اسے کوئی حسرت لاحق نہیں ہوئی، بلکہ وہ اس بات پر پوری طرح مطمئن رہا کہ دینِ حق کی پیروی نے اسے ان گندگیوں سے محفوظ رکھا ہے۔(تفہیم القران)۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ البلد(90)

آیت نمبر(1تا20)

ک ب د

(س) کَبَدًا درد جگر میں مبتلا ہونا۔تکلیف برداشت کرنا۔

کَبَدٌ اسم ذات ہے۔سختی،مشقت،زیر مطالعہ آیت۔4۔

ش ف ھ

(ف) شَفْھًا ہونٹ پر مارنا۔

شَفَۃٌ اسم ذات ہے۔ہونٹ۔تثنیہ شَفَتَانِ۔شَفَتَیۡنِ۔جمع شِفَاہٌ اور شَفَھَاتٌ۔(یہ دراصل شَفَھَۃٌ ہے۔اہل زبان اس کی ھا گرا کر شَفَۃٌ بولتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ جمع میں اس کی ھا واپس آجاتی ہے)۔زیر مطالعہ آیت۔9

ن ج د

(ن) نُجُوۡدًا ظاہر ہونا واضح ہونا۔

نَجۡدٌ اسم ذات ہے۔بلند راستہ۔واضح راستہ۔زیر مطالعہ آیت۔10۔

س غ ب

(س) سَغۡبًا وَمَسۡغَبَۃً بھوکا ہونا۔زیر مطالعہ آیت۔14۔

ء ص د

x x ثلاثی مجرد سے فعل نہیں آتا۔

(افعال) اِیۡصَادَ دروازہ یا ڈھکن بند کرنا۔

مُؤۡصَدٌ اسم المفعول ہے۔بند کیا ہوا۔سربمہر کیا ہوا۔زیر مطالعہ آیت۔20

ترکیب

(آیت۔5(یَحۡسَبُ میں شامل ھُوَ کی ضمیر فاعلی اَلۡاِنۡسَانَ کے لیے ہے۔(آیت۔13)فَکُّ رَقَبَۃٍ مرکب اضافی ہے اور خبر ہے۔اس کا مبتدا ھِیَ محذوف ہے(آیات۔14۔16)اِطۡعَامٌ مصدر ہے۔اس نے فعل کا کام کیا ہے اور یَتِیۡمًا اور مِسۡکِیۡنًا کو نصب دی ہے۔(دیکھیں آیت۔3/آل عمران:54،نوٹ۔1)۔نَارٌ نکرہ مخصوصہ ہے اور مُؤۡصَدَۃٌ اس کی خصوصیت ہے۔

ترجمہ

2004

لَآ اُقۡسِمُ	بِهٰذَا الۡبَلَدِ ۙ﴿۱﴾	وَاَنۡتَ حِلٌّۢ	بِهٰذَا الۡبَلَدِ ۙ﴿۲﴾
نہیں میں قسم کھاتا ہوں	اس شہر کی	اور آپ کو حلال (سمجھا) (کفار مکہ نے)	اس شہر میں

وَوَالِدٍ	وَّمَا وَلَدَ ۙ﴿۳﴾	لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ	فِىۡ كَبَدٍ ؕ﴿۴﴾
اور قسم ہے جننے والے کی	اور اس کی جو اس نے جنا	بیشک ہم نے پیدا کیا ہے انسان کو	ایک مشقت میں

اَيَحۡسَبُ	اَنۡ لَّنۡ يَّقۡدِرَ عَلَيۡهِ	اَحَدٌ ﴿۵﴾	يَقُوۡلُ اَهۡلَكۡتُ	مَالًا لُّبَدًا ؕ﴿۶﴾
کیا وہ (انسان) سمجھتا ہے	کہ ہرگز قابو نہیں پائے گا اس پر	کوئی ایک بھی	وہ کہتا ہے میں نے ہلاک کیا (خرچ کیا)	ڈھیروں ڈھیر مال

اَيَحۡسَبُ اَنۡ لَّمۡ يَرَهٗۤ	اَحَدٌ ؕ﴿۷﴾	اَلَمۡ نَجۡعَلۡ لَّهٗ	عَيۡنَيۡنِ ۙ﴿۸﴾
کیا وہ سمجھتا ہے کہ دیکھا ہی نہیں اس کو (کماتے خرچ کرتے)	کسی ایک نے بھی	کیا ہم نے نہیں بنائیں اس کے لیے	دو آنکھیں

وَلِسَانًا وَّشَفَتَيۡنِ ۙ﴿۹﴾	وَهَدَيۡنٰهُ النَّجۡدَيۡنِ ۚ﴿۱۰﴾	فَلَا اقۡتَحَمَ الۡعَقَبَةَ ۖ﴿۱۱﴾	وَمَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا الۡعَقَبَةُ ؕ﴿۱۲﴾
اور ایک زبان اور دو ہونٹ	اور ہم نے سمجھا دیئے اس کو دونوں راستے	پس وہ نہیں گھسا اُس گھاٹی میں	اور تو کیا سمجھا کیا ہے وہ گھاٹی

فَكُّ رَقَبَةٍ ۙ﴿۱۳﴾	اَوۡ اِطۡعٰمٌ فِىۡ يَوۡمٍ	ذِىۡ مَسۡغَبَةٍ ۙ﴿۱۴﴾	يَّتِيۡمًا ذَا مَقۡرَبَةٍ ۙ﴿۱۵﴾	اَوۡ مِسۡكِيۡنًا ذَا مَتۡرَبَةٍ ؕ﴿۱۶﴾
(وہ) کسی گردن کا چھڑانا ہے	یا کھلانا ہے کسی ایسے دن میں جو	بھوک والا ہو	کسی ایک یتیم کو جو قربت والا ہو	یا کسی ایسے مسکین کو جو محتاجی والا ہو

ثُمَّ كَانَ	مِنَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا	وَتَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ	وَتَوَاصَوۡا بِالۡمَرۡحَمَةِ ؕ﴿۱۷﴾	اُولٰٓـئِكَ اَصۡحٰبُ الۡمَيۡمَنَةِ ؕ﴿۱۸﴾
پھر وہ ہو (بھی)	ان لوگوں میں سے جو ایمان لائے	اور باہم تاکید کی ثابت قدم رہنے کی	اور باہم تاکید کی رحم دل ہونے کی	وہ لوگ داہنی طرف والے

وَالَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا بِاٰيٰتِنَا	هُمۡ اَصۡحٰبُ الۡمَشۡـئَمَةِ ؕ﴿۱۹﴾	عَلَيۡهِمۡ نَارٌ	مُّؤۡصَدَةٌ ﴿۲۰﴾
اور وہ لوگ جنہوں نے انکار کیا ہماری آیتوں کا	وہ بائیں طرف والے ہیں	ان پر ایک ایسی آگ ہے جو	اوپر سے بند کی ہوئی ہے

نوٹ:1 اس سورہ میں ایک بہت بڑے مضمون کی چند مختصر جملوں میں سمیٹ دیا گیا ہے۔ اور یہ قرآن کا کمال اعجاز ہے کہ ایک پورا نظریۂ حیات، جسے مشکل سے ایک ضخیم کتاب میں بیان کیا جا سکتا تھا، اسے اس چھوٹی سی سورہ کے چھوٹے چھوٹے فقروں میں نہایت مؤثر طریقہ سے بیان کر دیا گیا ہے۔ اس کا موضوع دنیا میں انسان کی، اور انسان کے لیے دنیا کی صحیح حیثیت سمجھانا اور یہ بتانا ہے کہ خدا نے انسان کے لیے سعادت اور شقاوت (نیک بختی اور بدبختی) کے دونوں راستے کھول کر رکھ دیئے ہیں، ان کے دیکھنے اور ان پر چلنے کے وسائل بھی اسے فراہم کر دیئے ہیں۔ اب یہ انسان کی اپنی کوشش اور محنت پر موقوف ہے کہ وہ سعادت کی راہ پر چل کر اچھے انجام کو پہنچتا ہے یا شقاوت کی راہ اختیار کر کے برے انجام سے دور چار ہوتا ہے۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ:2 آیت۔2۔ میں لفظ حِلٌّ میں دو احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ یہ حلول سے مشتق ہو، جس کے معنے کسی شئے کے اندر سمانے اور رہنے اور اترنے کے آتے ہیں۔ اس اعتبار سے حِلٌّ کے معنے اترنے اور رہنے کے ہوں گے اور مراد آیت کی یہ ہوگی کہ شہر مکہ خود بھی محترم ہے اور آپ ﷺ بھی اس شہر میں رہتے ہیں۔ اس لیے شہر کی عظمت و حرمت دوہری ہوگئی۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ لفظ حِلٌّ مصدر حِلّت سے مشتق ہو جس کے معنے کسی چیز کی حلال ہونے کے ہیں۔ اس اعتبار سے اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ آپ ﷺ کو کفار مکہ نے حلال سمجھ رکھا ہے۔ جس

مقدس مقام پر کسی جانور کا قتل بھی جائز نہیں ہے، اور ان لوگوں کا بھی یہی عقیدہ ہے، وہاں ان لوگوں نے اللہ کے رسول ﷺ کا قتل حلال سمجھ لیا ہے۔ دوسرے معنے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ آپ ﷺ کے لیے حرمِ مکہ میں قتالِ کفار حلال ہونے والا ہے جیسا کہ فتح مکہ میں ایک روز کے لیے کفار کا قتل حلال کر دیا گیا تھا۔ مظہری میں تینوں احتمال مذکور ہیں۔

آیت۔ 3۔ میں والد سے مراد حضرت آدمؑ ہیں اور مَا وَلَدَ سے ان کی اولاد مراد ہے جو ابتدائے دنیا سے قیامت تک ہو گی۔ آگے جواب قسم مذکور ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی فطرت سے ایسا پیدا کیا گیا ہے کہ اوّل عمر سے آخر تک محنتوں اور مشقتوں میں رہتا ہے۔ اس قسم اور جواب قسم میں انسان کو اس پر متنبہ کیا گیا ہے کہ تمہاری یہ خواہش کہ دنیا میں ہمیشہ راحت ہی راحت ملے اور کسی تکلیف سے سابقہ نہ پڑے، ایک خیال خام ہے جو کبھی حاصل نہیں ہو گا۔ ہر شخص کو دنیا میں محنت و مشقت اور رنج و مصیبت ضروری پیش آنی ہیں۔ اور جب ان کو پیش آنا ہی ہے تو عقلمند کا کام یہ ہے کہ اس چیز کے لیے مشقت جھیلے جو ہمیشہ اس کے کام آئے اور دائمی راحت کا سامان ہے۔ اور یہ صرف ایمان اور طاعت حق میں منحصر ہے۔ (معارف القرآن)۔

نوٹ:3

آیت۔6۔ میں یہ نہیں کہا کہ میں نے ڈھیر سا مال خرچ کر دیا، بلکہ اَهْلَكْتُ کہا ہے جس کے معنی ہیں کہ میں نے ڈھیر سا مال ہلاک کر دیا یعنی لٹا دیا یا اڑا دیا۔ اور یہ مال اڑا دینا کس مد میں تھا۔ کسی حقیقی نیکی کے کام میں نہیں، جیسا کہ آگے کی آیات سے خود بخود ظاہر ہو رہا ہے بلکہ اپنی دولت مندی کی نمائش اور فخر کے اظہار میں تھا۔ شادی اور غمی کی رسموں میں سینکڑوں آدمیوں کی دعوت کرنا، جوئے میں دولت ہار دینا، جوا جیت جانے پر اونٹ پر اونٹ کاٹنا اور یار دوستوں کو خراب کھلانا، میلوں میں بڑے لاؤ لشکر کے ساتھ جانا اور دوسرے سرداروں سے بڑھ کر شان و شوکت کا مظاہرہ کرنا۔ یہ اور ایسے ہی دوسرے نمائشی اخراجات تھے جنہیں جاہلیت میں آدمی کی فیاضی کی علامت اور اس کی بڑائی کا نشان سمجھا جاتا تھا۔ انہی پر اس کی تعریفوں کے ڈنکے بجتے تھے اور وہ خود بھی ان پر اپنا فخر جتاتے تھے۔

لیکن یہ فخر جتانے والا یہ نہیں سمجھتا کہ اوپر کوئی خدا بھی ہے جو دیکھ رہا ہے کہ اس نے کن ذرائع سے یہ دولت حاصل کی، کن کاموں میں اسے کھپایا اور کن اغراض و مقاصد کے لیے اس نے یہ سارے کام کیے۔ کیا وہ سمجھتا ہے کہ خدا کے ہاں اس فضول خرچی، اس شہرت طلبی اور اس تفاخر کی کوئی قدر ہو گی۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ:4

آیات۔8۔9۔ کا مطلب یہ ہے کہ کیا ہم نے اسے علم و عقل کے ذرائع نہیں دیئے۔ دو آنکھوں سے مراد گائے اور بھینس کی آنکھیں نہیں بلکہ وہ انسانی آنکھیں ہیں جنہیں کھول کر آدمی دیکھے تو اسے ہر طرف وہ نشانات نظر آئیں جو حقیقت کا پتہ دیتے ہیں۔ اور صحیح و غلط کا فرق سمجھاتے ہیں۔ زبان اور ہونٹوں سے مراد محض بولنے کے آلات نہیں ہیں بلکہ نفس ناطقہ جو ان آلات کی پشت پر سوچنے سمجھنے کا کام کرتا ہے۔ پھر انسان ان سے اظہارِ مافی الضمیر کا کام لیتا ہے۔

پھر آیت۔10۔ میں فرمایا کہ ہم نے محض عقل و فکر کی طاقتیں عطا کر کے انسان کو چھوڑ نہیں دیا کہ وہ اپنا راستہ خود تلاش کرے۔ بلکہ اس کی رہنمائی بھی کی۔ اس کے سامنے بھلائی اور برائی، نیکی اور بدی، دونوں کے راستے نمایاں کر کے رکھ دیئے تا کہ وہ سوچ سمجھ کر ان میں سے جس کو چاہے اختیار کر لے۔ یہ وہی بات ہے جو سورۂ دھر میں فرمائی گئی ہے کہ ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا تا کہ اس کا امتحان لیں اور اس غرض کے لیے ہم نے اسے سننے اور دیکھنے والا بنایا۔ ہم نے اسے راستہ دکھا دیا۔ خواہ شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ:5

آیت۔ 11۔ میں اَلْعَقَبَةَ آیا ہے۔ عقبہ پہاڑ کی بڑی چٹان کو بھی کہتے ہیں اور دو پہاڑوں کے درمیانی راستے یعنی گھاٹی کو

بھی۔دشمن سے نجات حاصل کرنے میں یہ عقبہ انسان کی مدد کرتا ہے کہ پہاڑ کے اوپر چڑھ کر دشمن سے اپنے آپ کو بچالے یا پھر گھاٹی میں داخل ہو کر کہیں نکل جائے۔اس جگہ طاعات وعبادات کو عقبہ سے تعبیر فرمایا ہے جس طرح عقبہ دشمن سے نجات دلانے کا سبب ہوتا ہے اسی طرح اعمال صالحہ آخرت کے عذاب سے نجات کا ذریعہ بنتے ہیں۔ پھر ان اعمال صالحہ میں پہلے فرمایا کسی غلام (یا مقروض) کو آزاد کرنا۔ یہ بہت بڑی عبادت ہے اور ایک انسان کی زندگی کو سنوار دینا ہے۔دوسری چیز بیان فرمائی بھوکے کو کھانا کھلانا۔کسی کو بھی کھانا کھلایا جائے وہ ثواب سے خالی نہیں ہے، لیکن جب کسی ایسے یتیم کو کھلایا جائے جس کے ساتھ رشتہ داری بھی ہے تو اس میں دوہرا ثواب ہو گیا۔ایک بھوکے کا پیٹ بھرنا دوسرے صلہ رحمی کا حق ادا کرنا۔اگر یتیم رشتہ دار نہ ہو تو ایسا مسکین ہو جو محتاج ہو۔(معارف القرآن)

نوٹ:6 آیت۔17۔کا مطلب یہ ہے کہ مذکورہ اوصاف کے ساتھ یہ ضروری ہے کہ آدمی مومن بھی ہو۔کیونکہ ایمان کے بغیر کوئی عمل نہ تو عمل صالح ہے اور نہ وہ اللہ کے ہاں مقبول ہو سکتا ہے۔قرآن مجید میں بکثرت مقامات پر اس کی تصریح کی گئی ہے کہ نیکی وہی قابل قبول اور ذریعہ نجات ہے جو ایمان کے ساتھ ہو۔مثلاً سورۂ نساء کی آیت۔124۔میں فرمایا کہ جو نیک اعمال کرے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اور (اس حال میں کہ) ہو وہ مومن، تو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے۔سورۂ نحل کی آیت۔97۔میں فرمایا کہ جو نیک عمل کرے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اور (اس حال میں کہ) ہو وہ مومن، تو ہم اسے پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے اور ایسے لوگوں کو ان کا اجر ان کے بہترین اعمال کے مطابق عطا کریں گے۔ جو شخص بھی قرآن پاک کا مطالعہ کرے گا وہ یہ دیکھے گا کہ اس کتاب میں جہاں بھی عمل صالح کے اجر کا ذکر ہے وہاں لازماً اس کے ساتھ ایمان کی شرط لگی ہوئی ہے۔ایمان کے بغیر عمل کو قرآن میں کہیں بھی اللہ کے ہاں مقبول نہیں قرار دیا گیا اور نہ اس پر کسی اجر کی امید دلائی گئی۔ (تفہیم القرآن)۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ الشمس (91)

آیت نمبر (1 تا 15)

ط ح ی

(ض) طَحْيًا کسی چیز کو پھیلانا۔زیر مطالعہ آیت۔6۔

ل ھ م

(س) لَهْمًا کسی چیز کو ایک ہی مرتبہ میں نگل جانا۔ہڑپ کر جانا۔

(افعال) اِلْهَامًا نگلوانا۔کسی کے دل میں کوئی بات القا کر دینا۔(لیکن یہ لفظ ایسی بات کے القا کے ساتھ مخصوص ہو چکا ہے جو اللہ تعالیٰ یا ملاء اعلیٰ کی جانب سے دل میں ڈالی جاتی ہے۔مفردات) زیر مطالعہ آیت۔8۔

ترکیب آیات۔5 تا 7 میں مَا کا لفظ آیا ہے۔اس کو مصدریہ بھی مانا گیا ہے اور موصولہ بھی۔عام قاعدہ یہ ہے کہ ذوی عقول کے لیے مَنۡ موصولہ آتا ہے اور غیر ذوی عقول کے لیے مَا آتا ہے۔لیکن عربی میں کبھی کبھی مَا بھی ذوی عقول کے لیے آجاتا ہے۔یعنی کبھی مَا بھی مَنۡ کے معنی میں آجاتا

ہے۔اس لحاظ سے دونوں ترجمے درست مانے جائیں گے۔ہم مَا مصدر یہ مان کر ترجمہ کریں گے۔(آیت۔6) طَحَا کا مادہ ''ط ح و'' بھی ہے اور ''ط ح ی'' بھی۔ناقص واوی میں یہ دوسرے معانی کے ساتھ پھیلنا (لازم) اور پھیلانا (متعدی) دونوں معانی میں آتا ہے۔جبکہ یائی میں یہ صرف پھیلانا (متعدی) کے معنی دیتا ہے۔اس طرح اس آیت میں طَحَا کو واوی بھی مان سکتے تھے اور یائی بھی۔لیکن قرآن مجید کی کتابت پر جب غور کرتے ہیں تو نظر آتا ہے کہ ھَا سے پہلے ایک دندانہ بنا ہوا ہے۔یہ اس بات کی علامت ہے کہ کاتبانِ وحی نے اس کو یائی مان کر لکھا تھا۔کیونکہ اگر واوی مان کر لکھتے تو یہ طَحٰھَا (دندانے کے بغیر) لکھا ہوتا۔طَحٰھَا لکھنے کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے ھا کی ضمیر طَحَا (وادی) پر نہیں بلکہ طَحٰی (یائی) پر لگائی ہے۔(آیت۔8) جوابِ قسم نہیں ہے بلکہ یہ سابقہ آیت میں قسم وَنَفْسٍ کا جز ہے۔ان قسموں کا جوابِ قسم آگے آیات۔9۔10۔میں آیا ہے۔دَسّٰھَا۔ یہ اگر مادہ ''دسس'' کے ثلاثی مجرد سے ہوتا تو یہ دَسَّھَا ہوتا۔نہ سین پر کھڑا زبر ہوتا اور نہ اس کے آگے یا کا دندانہ ہوتا۔اس سے معلوم ہوا کہ یہ بابِ تفعیل سے ماضی کا صیغہ دَسَّسَ ہے۔قاعدے کے مطابق تیسری سین یا میں تبدیل ہوئی تو یہ دَسَّیَ ہوا۔ پھر قاعدے کے مطابق دَسّٰی استعمال ہوتا ہے۔ (دیکھیں آیت۔ 2/البقرۃ: 259، نوٹ۔ 2) (آیت۔13)۔نَاقَةَ اللّٰهِ میں نَاقَةَ کی نصب بتا رہی ہے کہ اس کا فعل محذوف ہے جو کہ اِحْذَرُوْا (تم لوگ محتاط رہو) ہو سکتا ہے۔

ترجمہ

وَالشَّمْسِ وَضُحٰىهَا ۙ﴿۱﴾	وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰىهَا ۙ﴿۲﴾
قسم ہے سورج کی اور اس کی روشنی کی	اور قسم ہے چاند کی جب وہ پیچھے پیچھے آتا ہے اس (سورج) کے

وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰىهَا ۙ﴿۳﴾	وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰىهَا ۙ﴿۴﴾
اور قسم ہے دن کی جب وہ خوب روشن کر دیتا ہے اس (سورج) کو	اور قسم ہے رات کی جب وہ ڈانپ لیتی ہے اس (سورج) کو

وَالسَّمَآءِ	وَمَا	بَنٰىهَا ۙ﴿۵﴾	وَالْاَرْضِ	وَمَا	طَحٰىهَا ۙ﴿۶﴾
اور قسم ہے آسمان کی	اور اس کی جیسا	اس نے بنایا اس (آسمان) کو	اور قسم ہے زمین کی	اور اس کی جیسا	اس نے پھیلایا اس کو

وَنَفْسٍ	وَّمَا	سَوّٰىهَا ۙ﴿۷﴾	فَاَلْهَمَهَا
اور قسم ہے نفس کی	اور اس کی جیسا	اس نے سنوارا اس کو	پھر اس نے الہام کیا اس میں

فُجُوْرَهَا	وَتَقْوٰىهَا ۙ﴿۸﴾	قَدْ اَفْلَحَ مَنْ	زَكّٰىهَا ۙ﴿۹﴾
اس کی نافرمانی	اور اس کی پرہیزگاری (کا شعور)	مراد پا چکا ہے وہ جس نے	پاک رکھا اس (نفس) کو

وَقَدْ خَابَ مَنْ	دَسّٰىهَا ؕ﴿۱۰﴾	كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ	بِطَغْوٰىهَآ ۙ﴿۱۱﴾
اور نامراد ہو گیا وہ جو	خاک آلود کرتا رہا اس (نفس کو)	جھٹلایا ثمود نے (رسول کو)	اپنی سرکشی کے باعث

اِذِ انْۢبَعَثَ	اَشْقٰىهَا ۙ﴿۱۲﴾	فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ	نَاقَةَ اللّٰهِ	وَسُقْيٰهَا ؕ﴿۱۳﴾
اب اٹھ کھڑا ہوا	ان کا زیادہ شقی	تو کہا اُن لوگوں سے اللہ کے رسولؐ نے	(محتاط رہو) اللہ کی اونٹنی سے	اور اس کے پینے (کی باری) سے

فَكَذَّبُوْهُ	فَعَقَرُوْهَا ۙ۠	فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ 2004
پھرانہوں نے جھٹلایا اُن (رسولؑ) کو	توانہوں نے ٹانگیں کاٹیں اس (اونٹنی) کی	پس دھمادھم برسایاان پر (عذاب)

رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ	فَسَوّٰىهَا ۖ ⑭	وَلَا يَخَافُ	عُقْبٰهَا ⑮ ع
ان کے رب نے ان کے گناہ کے باعث	تواس نے برابر کردیااس (قوم) کو	اوروہ نہیں ڈرتا	اس کے نتیجے سے

نوٹ:1

مضمون کے لحاظ سے یہ سورہ دوحصوں میں مشتمل ہے۔ پہلا حصہ سورہ کے آغاز سے آیت۔10۔ پر ختم ہوتا ہے۔اور دوسرا حصہ آیت۔11۔ سے آخر تک چلتا ہے۔ پہلے حصے میں تین باتیں سمجھائی گئی ہیں۔ایک یہ جس طرح چاند،سورج،رات،دن اورزمین وآسمان ایک دوسرے سے مختلف اورنتائج میں متضادہیں اسی طرح سے نیکی اور بدی بھی ایک دوسرے سے مختلف اورنتائج میں متضادہیں۔دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ نے نفس انسانی کوجسم،حواس اورذہن کی قوتیں دے کرایک فطری الہام کے ذریعے اس کے لاشعور میں نیکی اور بدی کا فرق،ان کے مابین امتیازاورایک کے خیراوردوسرے کے شر ہونے کا احساس اتاردیا ہے۔تیسرے یہ کہ انسان کے مستقبل کا انحصاراس پر ہے کہ وہ اپنے نفس کے اچھے اور بُرے رجحانات میں سے کس کوابھارتااورکس کودباتا ہے۔دوسرے حصے میں قوم ثمود کی تاریخی مثال پیش کرتے ہوئے رسالت کی اہمیت سمجھائی گئی ہے۔رسول دنیامیں اس لیے بھیجاجاتا ہے کہ بھلائی اور برائی کا جوالہامی علم اللہ نے انسان کی فطرت میں رکھ دیا ہے،وہ بجائے خودانسان کی ہدایت کے لیے کافی نہیں ہے۔کیونکہ اس الہامی علم کو پوری طرح نہ سمجھنے کی وجہ سے ہی انسان خیروشر کے غلط فلسفے اورمعیارتجویز کر کے گمراہ ہوتا رہا ہے۔اس لیے اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام علیہم السلام پر واضح اور صاف صاف وحی نازل فرمائی تاکہ وہ لوگوں کوکھول کر بتائیں کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں نیکی کیاہےاور بدی کیا ہے۔(تفہیم القرآن)۔

نوٹ:2

آیت۔8۔کاجملہ ساتویں قسم وَنَفْسٍ کے ساتھ مربوط ہے۔مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نفس انسانی کو بنایا پھر اس کے دل میں فجوراور تقویٰ،دونوں کاالہام کردیا۔مرادیہ ہے کہ نفس انسانی کی تخلیق میں حق تعالیٰ نے گناہ اورطاعت،دونوں کے مادے اوراستعدادرکھ دی ہے۔ پھرانسان کوایک اختیاراورقدرت دے دی کہ وہ اپنے ارادےاوراختیارسے گناہ کی راہ اختیارکرلے یاطاعت کی۔ جب وہ اپنے ارادےاور اختیارسےان میں سےکوئی راہ اختیارکرتا ہےتواسی ارادےاوراختیار پراس کوثواب یاعذاب ملتا ہے۔(معارف القرآن)۔

اس جگہ یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ فطری الہام اللہ تعالیٰ نے ہرمخلوق پراس کی نوعیت کے لحاظ سے کیا ہے۔مثلاً حیوانات کی ہرنوع کواس کی ضرورت کے مطابق الہامی علم دیا ہےجس کی بنا پر مچھلی کوتیرنا،پرندے کواڑنا،شہد کی مکھی کوچھتہ بنانا اور بئے (چھوٹی چڑیا) کو گھونسلابنانا آجاتا ہے۔انسان کواس کی مختلف حیثیتوں کے لحاظ سے الگ الگ قسم کے الہامی علوم دیئے گئے ہیں۔انسان کی ایک حیثیت یہ ہے کہ وہ ایک حیوانی وجود ہے۔اس حیثیت سے جوالہامی علم اس کودیا گیا ہےاس کی ایک نمایاں ترین مثال بچے کاپیداہوتے ہی ماں کا دودھ چوسنا ہے۔اس کی تعلیم اگرخدانے فطری طور پراس کو نہ دی ہوتی توکوئی اسے یہ فن نہ سکھا سکتا تھا۔اس کی دوسری حیثیت یہ ہے کہ وہ ایک عقلی وجود ہے۔اس حیثیت سے خدانے انسان کے آغاز سے مسلسل اس کوالہامی رہنمائی دی ہےجس کی بدولت وہ پے درپے ایجادات کر کے تمدن میں ترقی کررہا ہےان ایجادات کی تاریخ کا جوشخص بھی مطالعہ کرے گاوہ محسوس کرے گا کہ ان میں شاید ہی کوئی ایسی ہوجومحض انسانی فکروکاوش کانتیجہ ہو،ورنہ ہرایک کی ابتدااسی طرح ہوئی ہے کہ کسی شخص کے ذہن میں ایک بات آگئی اوراس کی بدولت اس نے کوئی چیزایجاد کرلی۔ان دونوں حیثیتوں کے علاوہ انسان کی ایک اورحیثیت یہ ہے کہ وہ ایک اخلاقی وجود ہے۔اس حیثیت سے بھی اللہ تعالیٰ نے اسے خیروشر کاامتیازاور خیر کے خیر ہونے اورشر کے شر ہونے کا احساس الہامی طور پرعطا کیا ہے۔یہ امتیازاوراحساس ایک عالمگیر حقیقت ہے۔دنیا میں کبھی کوئی انسانی معاشرہ خیروشر کے تصورات سے خالی نہیں رہا۔اورکوئی ایسامعاشرہ نہ تاریخ میں کبھی پایا گیا ہےاورنہ اب پایا جاتا ہےجس کے نظام میں بھلائی اور برائی پرجزااورسزا کی کوئی نہ کوئی صورت اختیارنہ کی گئی ہو۔اس چیز کاہرزمانے،ہرجگہ اور ہرمرحلۂ تہذیب و

تمدن میں پایا جانا، اس کے فطری ہونے کا صریح ثبوت ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ یہ اس حقیقت کا بھی ثبوت ہے کہ ایک حکیم اور دانا خالق نے اسے انسان کی فطرت میں ودیعت کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جن مادی اجزا سے انسان کا جسمانی وجود مرکب ہے اور دنیا کا مادی نظام جن قوانین کے تحت چل رہا ہے، ان کے اندر کہیں بھی اخلاق کے ماخذ کی نشاندہی نہیں کی جاسکتی۔ تفہیم القرآن)۔

نوٹ:3

گزشتہ آیات میں جو قسمیں کھائی گئی ہیں، وہ جس بات پر کھائی گئی ہیں، اسے آیات۔ 9۔10 میں بیان کیا گیا ہے کہ جو اپنے نفس کو فجور سے پاک کرے اور اس کے اندر بھلائی کو نشوونما دے وہ فلاح پائے گا۔ اور وہ شخص نامراد ہوگا جو نیکی کے رجحانات کو دبا دے اور فجور کو تقویٰ پر غالب کردے۔ بعض مفسرین نے ان آیات کے یہ معنی بیان کیے ہیں کہ فلاح پا گیا وہ جس کے نفس کو اللہ نے پاک کر دیا اور نامراد ہوا وہ جس کے نفس کو اللہ نے دبا دیا، لیکن یہ تفسیر زبان کے لحاظ سے قرآن کے طرز بیان کے خلاف ہے۔ اور یہ تفسیر اسی موضوع پر قرآن کے دوسرے بیانات سے ٹکراتی ہے۔ مثلاً سورۂ اعلیٰ کی آیت۔ 14۔ میں ہے کہ فلاح پا گیا وہ جس نے پاکیزگی اختیار کی۔ سورۂ عبس میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو خطاب کر کے فرمایا کہ آپ ﷺ پر کیا ذمہ داری ہے اگر وہ پاکیزگی نہ اختیار کرے۔ ان دونوں آیتوں میں پاکیزگی اختیار کرنا بندے کا فعل قرار دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ قرآن میں جگہ جگہ یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ اس دنیا میں انسان کا امتحان لیا جارہا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ امتحان سرے سے بے معنی ہوجاتا ہے اگر امتحان لینے والا پہلے ہی ایک امیدوار کو ابھار دے اور دوسرے کو دبا دے۔ اس لیے صحیح تفسیر وہی ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ زَكّٰهَا اور دَسّٰهَا کا فاعل بندہ ہے نہ کہ خدا۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ:4

آیات۔ 12۔ اور 14۔ پر غور کرنے سے ایک خاص بات یہ سامنے آتی ہے کہ اگرچہ اونٹنی کے قتل کا ارتکاب قوم کے اندر سے ایک ہی شخص نے کیا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کا مجرم پوری قوم کو ٹھہرایا اور اس کی سزا بھی پوری قوم کو دی۔ اس سے قرآن کے فلسفۂ تاریخ کا یہ نکتہ سامنے آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک شخص کے جرم میں پوری قوم کو سزا دیتا ہے اگر قوم اس جرم پر راضی ہو۔ اس کے وبال سے صرف وہی لوگ بچتے ہیں جو اپنے مقدور بھر اس کی اصلاح کے لیے جو کر سکتے ہوں وہ کر گزریں اور اگر کچھ نہ کر سکتے ہوں تو ایمان کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ اس سے بیزار اور کنارہ کش رہیں۔ اس سے نیچے نہ ایمان کا کوئی درجہ ہے نہ خدا کی پکڑ سے بچنے کی کوئی سبیل ہے۔

بِذَنۡۢبِهِمۡ کے الفاظ سے وضاحت ہوگئی کہ عذاب ان کے اوپر اس جرم کے سبب سے آیا کہ اللہ کے رسول کی تنبیہہ کے باوجود انہوں نے اونٹنی کو گزند پہنچانے کی جسارت کی۔ ظاہر ہے کہ اس جرم کے بعد اگر ان کو ڈھیل ملتی تو وہ اللہ کے رسول پر بھی ہاتھ ڈالنے کی جسارت کر گزرتے اور یہ وہ جرم ہے جس کی مہلت اللہ تعالیٰ نے کسی قوم کو نہیں دی بلکہ جب کسی قوم نے رسول کے قتل کا ارادہ کیا تو وہ تباہ کر دی گئی۔ (یہ سنت الٰہی رسولوں سے متعلق ہے۔ جبکہ انبیاء قتل کیے گئے ہیں۔ مرتب)

معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورہ اس دور میں نازل ہوئی ہے جب قریش کے لیڈروں نے رسول اللہ ﷺ کے قتل کے مشورے شروع کر دیئے تھے۔ یہ مشورے چونکہ خفیہ تھے۔ اس وجہ سے قرآن نے بھی اشارات کی زبان میں ان کو آگاہی دے دی کہ اگر وہ کوئی ارادہ بد اپنے دل میں پرورش کر رہے ہیں تو اس کے دوررس نتائج پر نگاہ ڈال لیں۔ (تدبر قرآن)

نوٹ:5

آیت۔ 15۔ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کو تباہ کرتا ہے، تو اپنی اس سنت کے مطابق کرتا ہے جو اس نے اس دنیا کی مصلحت اور

بہبود کے لیے اپنے علم اور قدرت کے تحت ٹھہرا رکھی ہے اس وجہ سے نہ اس کو یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ نتیجہ کے اعتبار سے اس کے اس فیصلے میں کوئی غلطی ہوسکتی ہے اور نہ یہ خوف ہوتا ہے کہ اس کو کوئی چیلنج کرسکتا ہے۔ اس سے ضمنی طور ان لغو بیانات کی بھی نفی ہو جاتی ہے جو تورات کی کتاب پیدائش میں اس کے راویوں نے ملائے ہیں۔ مثلاً ''اور خداوند نے دیکھا کہ زمین پر انسان کی بدی بہت بڑھ گئی اور اس کے تصور اور خیالات سدا (ہمیشہ) برے ہیں، تب خداوند زمین پر انسان کو پیدا کرنے سے ملول ہوا اور دل میں غم کیا۔'' (پیدائش۔ باب۔ 6۔ آیت۔ 5۔ 6) (تدبر قرآن)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ الیل (92)

آیت نمبر (1 تا 21)

ترکیب

(آیت۔4) شَتّٰی۔ یہ مادہ ''ش ت ت'' سے باب تفعیل کا ماضی کا صیغہ نہیں ہے کیونکہ اس پر اِنَّ کی خبر پر آنے والا لامِ تاکید لگا ہوا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ دراصل فَعِیۡلٌ کے وزن پر صفت شَتِیۡتٌ کی جمع ہے، جیسے مَرِیۡضٌ کی جمع مَرۡضٰی ہے اس حوالے سے یہاں پر یہ بھی نوٹ کرلیں کہ فُعۡلٰی کا وزن افعل تفضیل کی مؤنث کے لیے ہے۔ جبکہ فَعۡلٰی جمع مکسر کے اوزان میں سے ایک وزن ہے۔ (آیت۔ 11) تَرَدّٰی میں یا اصلی ہے۔ یعنی یہ مادہ ''ردی'' سے باب تفعل کا ماضی تَرَدَّیَ ہے جو قاعدے کے مطابق تبدیل ہو کر تَرَدّٰی استعمال ہوتا ہے۔ (آیت۔12) اِنَّ کا اسم اَلۡھُدٰی ہے اور اس کی خبر محذوف ہے جو وَاجِبٌ ہوسکتی ہے۔ خبر محذوف ہونے کی وجہ سے اِنَّ کی خبر پر آنے والا لامِ تاکید اس کے اسم پر آ گیا ہے، جس نے اَلۡھُدٰی کے ہمزۃ الوصل کو لکھنے میں بھی ساقط کر دیا۔ عَلَیۡنَا قائم مقام خبر مقدم ہے۔ (آیت۔13) اِنَّ کا اسم ہونے کی وجہ سے اَلۡاٰخِرَۃَ حالتِ نصب میں آیا ہے۔ اس کی بھی خبر محذوف ہے اس لیے لام تاکید اَلۡاٰخِرَۃَ پر داخل ہوا تو لَلۡاٰخِرَۃَ استعمال ہوا۔ اَلۡاُوۡلٰی بھی اِنَّ کا اسم ہے لیکن فُعۡلٰی کے وزن پر رفع۔ نصب۔ جر ظاہر نہیں ہوتی۔ آیت نمبر 14 میں تَلَظّٰی باب تفعل کا صیغہ واحد مونث غائب ہے۔ جو اصل میں تَتَلَظّٰی تھا۔ ایک تا کو گرا دیا گیا ہے۔ (آیت۔15) یَصۡلٰھَا میں ھَا کی ضمیر نَارًا تَلَظّٰی کے لیے ہے اور یَصۡلٰی کا فاعل اَلۡاَشۡقَی ہے۔ یہ افعل تفضیل کے مذکر کے وزن اَفۡعَلُ پر حالت رفع میں اَشۡقَی تھا جو قاعدے کے مطابق تبدیل ہو کر اَشۡقٰی آیا ہے۔ آگے م لانے کے لیے کھڑی زبر کو ہٹا کر اس پر پڑی زبر ڈالی ہے۔ (آیت۔18) یَتَزَکّٰی باب تفعل سے مضارع کا صیغہ ہے اور یہاں یہ حال کے طور پر آیا ہے۔ کیونکہ کوئی اسم جب حال کے طور پر آتا ہے تو وہ حالت نصب میں ہوتا ہے اور کوئی فعل جب حال کے طور پر آتا ہے تو وہ مضارع کا کوئی صیغہ ہوتا ہے۔ (آیت۔19) عِنۡدَہٗ کی ضمیر اَلۡاَتۡقٰی کے لیے ہے۔ تُجۡزٰی کا نائب فاعل ہونے کی وجہ سے مِنۡ نِعۡمَۃٍ مَحلًا حالت رفع میں ہے۔

ترجمہ

وَالَّیۡلِ اِذَا یَغۡشٰی ۙ﴿۱﴾	وَالنَّھَارِ اِذَا تَجَلّٰی ۙ﴿۲﴾	وَمَا
قسم ہے رات کی جب وہ چھا جاتی ہے	اور قسم ہے دن کی جب وہ خوب روشن ہوتا ہے	اور قسم ہے اس کی جو

خَلَقَ الذَّکَرَ وَالۡاُنۡثٰی ۙ﴿۳﴾	اِنَّ سَعۡیَکُمۡ لَشَتّٰی ؕ﴿۴﴾	فَاَمَّا مَنۡ	اَعۡطٰی وَاتَّقٰی ۙ﴿۵﴾
اس نے پیدا کیے مذکر اور مؤنث	بیشک تم لوگوں کی سعی و جہد متفرق ہے	پس وہ جو ہے جس نے	خوش دلی سے دیا اور پرہیز گار رہا

وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۙ(6)	فَسَنُيَسِّرُهٗ	لِلْيُسْرٰى ؕ(7)	وَاَمَّا مَنْۢ
اور اس نے تصدیق کی اس بڑی بھلائی کی	تو ہم پہنچا دیں گے اس کو	اس بڑی آسانی تک	اور وہ جو ہے جس نے

بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ۙ(8)	وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۙ(9)	فَسَنُيَسِّرُهٗ	لِلْعُسْرٰى ؕ(10)
کنجوسی کی اور بے پرواہ ہوا	اور اس نے جھٹلایا اس بڑی بھلائی کو	تو ہم پہنچا دیں گے اس کو	اُس بڑی سختی تک

وَمَا يُغْنِيْ عَنْهُ مَالُهٗٓ	اِذَا تَرَدّٰى ؕ(11)	اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى ۖ(12)
اور کام نہ آئے گا اس کے اس کا مال	جب وہ گڑھے میں گرے گا	بیشک ہم پر یقیناً ہے راہ سمجھا دینا

وَاِنَّ لَنَا	لَلْاٰخِرَةَ	وَالْاُوْلٰى (13)
اور بیشک ہمارے لیے ہی (قبضۂ قدرت میں)	آخرت (بھی) ہے	اور یہ پہلی (دنیا) بھی ہے

فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا	تَلَظّٰى ۚ(14)	لَا يَصْلٰىهَآ اِلَّا الْاَشْقَى ۙ(15)
پس میں نے خبردار کر دیا تم لوگوں کو ایک ایسی آگ سے	جو غصہ سے بھڑک اٹھتی ہے	نہیں گرے گا اس میں مگر بڑا بدبخت

الَّذِيْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ؕ(16)	وَسَيُجَنَّبُهَا	الْاَتْقَى ۙ(17)	الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ
وہ جس نے جھٹلایا اور منہ پھیرا	اور بچا لیا جائے گا اس (آگ) سے	بڑے پرہیزگار کو	وہ جو دیتا ہے اپنا مال

يَتَزَكّٰى ۚ(18)	وَمَا لِاَحَدٍ	عِنْدَهٗ	مِنْ نِّعْمَةٍ
پاکیزگی حاصل کرتے ہوئے	اس حال میں کہ نہیں ہے کسی ایک کا	اس کے پاس (یعنی اس پر)	کوئی بھی ایسی نعمت (احسان) جس کا

تُجْزٰٓى ۙ(19)	اِلَّا	ابْتِغَاۗءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ۚ(20)	وَلَسَوْفَ يَرْضٰى ۧ(21)
بدلہ دیا جاتا ہو	سوائے اس کے کہ	اپنے اعلیٰ رب کی توجہ کی جستجو کرنا	اور یقیناً عنقریب وہ راضی ہوگا

نوٹ: 1

آیات۔ 5۔ 6۔ میں انسانی کوششوں کی ایک قسم میں تین کا ذکر کیا گیا ہے غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام خوبیوں کی جامع ہیں۔ ایک یہ کہ انسان زر پرستی میں مبتلا نہ ہو بلکہ کھلے دل سے اپنا مال، جتنا کچھ اللہ نے دیا ہے، اللہ اور اس کے بندوں کے حقوق ادا کرنے میں صرف کرے۔ دوسرے یہ کہ اس کے دل میں خدا کا خوف ہو۔ وہ زندگی کے ہر شعبہ میں ان کاموں سے پرہیز کرے جو خدا کی ناراضی کے موجب ہوں۔ تیسرے یہ کہ وہ بھلائی کی تصدیق کرے۔ بھلائی ایک وسیع المعانی لفظ ہے جس میں عقیدے، اخلاق اور اعمال، تینوں کی بھلائی شامل ہے۔ انسانی کوششوں کی اس قسم کا نتیجہ اگلی آیت میں بیان ہوا ہے اس طرزِ زندگی میں سب سے پہلی آسانی انسان کو یہ حاصل ہوتی ہے کہ یہ راستہ انسانی فطرت کے مطابق ہے۔ اس میں انسان کو اپنے ضمیر سے لڑ کر نہیں چلنا پڑتا۔ اس میں انسان کو ہر طرف اس مزاحمت اور کشمکش سے سابقہ پیش نہیں آتا جو گناہوں سے بھری زندگی میں پیش آتا ہے۔ اور معاشرے میں اسے ہر قدم پر صلح و آشتی اور قدر و منزلت میسر آتی چلی جاتی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جو آدمی اپنا مال خلقِ خدا کی بھلائی کے لیے خرچ کر رہا ہو، جس سے کسی کو خیانت، ظلم اور زیادتی کا اندیشہ نہ ہو، وہ خواہ کیسے ہی بگڑے ہوئے معاشرے میں رہتا ہو، بہرحال اس کی قدر ہو کر رہتی ہے۔ لوگ اس کی طرف کھنچتے ہیں۔ اس کا اپنا قلب و ضمیر بھی مطمئن ہوتا ہے اور معاشرے میں اس کو وہ وقار حاصل ہوتا ہے جو کبھی بھی بدکردار آدمی کو حاصل نہیں ہوتا۔ یہی بات سورۂ نحل کی آیت۔ 97۔ میں اس طرح فرمائی گئی کہ جو شخص نیک عمل کرے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اور (یعنی اس حال میں کہ) ہو وہ مومن، تو اسے ہم

پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے۔اور اسی بات کو سورۂ مریم کی آیت۔96، میں یوں فرمایا گیا کہ یقیناً جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے،تو رحمان ان کے لیے دلوں میں محبت پیدا کر دے گا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس سے پہلے سورۂ بلد میں اسی راستے کو دشوار گزار گھاٹی کہا گیا ہے اور یہاں اس کو آسان راستہ قرار دیا گیا ہے۔ان دونوں باتوں میں تطبیق کیسے ہوگی۔اس کا جواب یہ ہے کہ اس راہ کو اختیار کرنے سے پہلے یہ آدمی کو دشوار گزار گھاٹی ہی محسوس ہوتی ہے جس پر چڑھنے کے لیے اسے اپنے نفس کی خواہشوں سے،اپنے دنیا پرست اہل وعیال سے،اپنے رشتہ داروں سے،اپنے دوستوں اور معاملہ داروں سے اور سب سے بڑھ کر شیطان سے لڑنا پڑتا ہے۔کیونکہ ہر ایک اس میں رکاوٹیں ڈالتا ہے اور اس کو خوفناک بنا کر دکھاتا ہے۔لیکن جب انسان اس پر چلنے کا عزم کر لیتا ہے تو اس گھاٹی پر چڑھنا اس کے لیے آسان اور اخلاقی پستیوں کے کھڈ میں لڑھکنا اس کے لیے مشکل ہو جاتا ہے۔(مطلب یہ ہے کہ اس راستے پر چلنے سے پہلے یہ انسان کو دشوار گزار محسوس ہوتا ہے۔لیکن جب وہ عملاً اس پر چلنا شروع کر دیتا ہے تو پھر اسے بتدریج وہ آسانیاں میسر آنا شروع ہو جاتی ہیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔مرتب) پھر یہی وہ راستہ ہے جس میں دنیا سے لے کر آخرت تک انسان کے لیے سرور ہی سرور اور راحت ہے۔اس کے نتائج عارضی اور وقتی نہیں بلکہ ابدی اور لازوال ہیں۔(تفہیم القران)

نوٹ:2

آیات۔8۔9۔میں انسانی کوششوں میں سے دوسری قسم کا بیان ہے جو اپنے ہر جز میں پہلی قسم کے ہر جز سے مختلف ہے۔عام طور پر لوگ اس آدمی کو کنجوس کہتے ہیں جو روپیہ پیسہ جوڑ کر رکھتا ہے اور اسے اپنے اور اپنے بال بچوں پر خرچ نہیں کرتا۔لیکن اس جگہ بخل سے مراد راہ خدا میں اور نیکی کے کاموں میں خرچ نہ کرنا ہے۔اس لحاظ سے وہ شخص بھی بخیل ہے جو اپنی ذات پر،اپنے عیش وآرام اور تفریحات پر تو دل کھول کر خرچ کرتا ہے،مگر کسی نیک کام کے لیے اس کی جیب سے کچھ نہیں نکلتا۔بے نیازی برتنے سے مراد یہ ہے کہ آدمی دنیا کے فائدہ ہی کو اپنی ساری تگ ودو کا مقصود بنالے اور اس بات کی کچھ پرواہ نہ کرے کہ کس کام سے اللہ تعالیٰ خوش ہوتا ہے اور کس کام سے ناراض ہوتا ہے۔اس راستہ کو سخت اس لیے کہا گیا ہے کہ اس پر چلنے والا اگرچہ دنیوی لذتوں اور ظاہری کامیابیوں کے لالچ میں اس طرف جاتا ہے لیکن اس میں ہر وقت اپنی فطرت سے،اپنے ضمیر سے،اللہ کے بنائے ہوئے قوانین سے اور معاشرے سے اس کی جنگ جاری رہتی ہے۔اگر وہ کمزور ہو تو اس روش کے عوض اسے طرح طرح کی سزائیں بھگتنی ہوتی ہیں۔اور اگر وہ طاقتور اور بااثر ہو تو چاہے دنیا اس کے زور آگے دب جائے لیکن کسی کے دل میں اس کے لیے خیر خواہی،عزت اور محبت کا کوئی جذبہ نہیں ہوتا،اور یہ جو فرمایا گیا کہ ایسے شخص کو ہم سخت راستے پر چلنے کی سہولت دیں گے،تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس سے بھلائی کے راستے پر چلنے کی توفیق سلب کر لی جائے گی۔برائی کے دروازے اس کے لیے کھول دیئے جائیں گے اور اسی کے اسباب اور وسائل اسے فراہم کر دیئے جائیں گے۔بدی کرنا اس کے لیے آسان ہو جائے گا۔(تفہیم القرآن)

نوٹ:3

آیت۔15 میں ہے کہ اس میں یعنی بھڑکتی آگ میں وہی گرے گا جو زیادہ شقی ہے۔یہاں بھڑکتی آگ سے شاید دوزخ کا وہ طبقہ مراد ہوگا جو بڑے بھاری مجرموں اور بدبختوں کے لیے مخصوص ہے۔(ترجمہ شیخ الہند)۔اس لحاظ سے آیت۔17۔کا مطلب یہ سمجھ میں آتا ہے کہ جو جتنا زیادہ پرہیزگار ہوگا اس کو اس بھڑکتی آگ سے اتنا ہی دور رکھا جائے گا۔(مرتب)

2004

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

2029

سورۃ الضحیٰ (93)

آیت نمبر (1 تا 11)

س ج و

(ن) سَجۡوًا رات کا پرسکون ہونا۔ سنسان ہونا۔ خاموش ہونا۔ پھر اس سے مراد لیتے ہیں رات کا چھا جانا۔ زیر مطالعہ آیت۔2۔ (اس کا مادہ ناقص واوی ہے اور اس کا ماضی کا صیغہ سجا یا سجی لکھا جاتا ہے یہاں اس کو سجیٰ (ناقص یائی کی طرح لکھنا قرآن کا مخصوص املا ہے)۔

ترکیب

(آیت۔2) سَجٰی ماضی ہے لیکن اِذَا کی وجہ سے ترجمہ حال میں ہوگا۔ (آیات۔6۔7۔اور 8۔ میں فَاٰوٰی، فَهَدٰی اور فَاَغۡنٰی، اِن تینوں کے آگے ضمیر مفعولی كَ محذوف ہے۔ (آیت۔7) اس میں ضَآلًّا اسم الفاعل ہے۔ سورۃ الفاتحہ میں اس کی جمع ضَالِّيۡنَ آئی ہے۔ وہاں اس کا ترجمہ 'گمراہ' کیا جاتا ہے۔ جبکہ یہاں اس کا ترجمہ راستہ تلاش کرنے والا کیا جاتا ہے۔ اس کی وضاحت کے لیے استادِ محترم پروفیسر حافظ احمد یار صاحب مرحوم نے فرمایا کہ انہوں نے متعدد ڈکشنریاں اور کُتب دیکھیں تو اس لفظ کے کوئی بارہ مختلف مفاہیم میں استعمال سامنے آئے۔ اور قرآن مجید میں بھی یہ متعدد مفاہیم میں آیا ہے۔ پھر انہوں نے تلاش کیا کہ اس لفظ کا وہ بنیادی معنی کیا ہے جس سے یہ تمام مفاہیم نکلتے ہیں۔ تو انہوں نے امام راغب اصفہانیؒ کے بیان کردہ معنی کو اس لحاظ سے سب سے زیادہ تسلی بخش پایا۔ امام صاحب نے اس کے معنی بتائے ہیں کہ مطلوبہ راستہ سے ہٹ جانا، خواہ قصداً ہو یا سہواً، معمولی ہو یا زیادہ۔ قرآن میں اس کے مختلف استعمال کا ایک خاکہ ذہن نشین کرنے کے لیے طلبا زیر حوالہ آیات کو قرآن میں دیکھ لیں۔ واضح رہے کہ یہ مکمل فہرست نہیں ہے البقرہ۔282۔ (اَنۡ تَضِلَّ اِحۡدٰىهُمَا)۔ الانعام۔24۔ بنی اسرائیل۔67۔ الکہف۔104، طٰہٰ۔52۔ محمد۔1۔ (آیات۔9 تا 11) اَلۡيَتِيۡمَ اور اَلسَّآئِلَ کی نصب بتا رہی ہے کہ یہ لَا تَقۡهَرۡ اور لَا تَنۡهَرۡ کے مفعول مقدم ہیں اور حَدِّثۡ کے مفعول پر بِ کا صلہ آتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ بِنِعۡمَةِ رَبِّكَ یہ پورا فقرہ حَدِّثۡ کا مفعول مقدم ہے۔ اَلۡيَتِيۡمَ اور السَّآئِلَ پر لام جنس ہے۔

ترجمہ

وَالضُّحٰى ۙ﴿۱﴾	وَالَّيۡلِ اِذَا سَجٰى ۙ﴿۲﴾	مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ
قسم ہے چاشت کے وقت کی	اور قسم ہے رات کی جب سناٹا ہو جاتا ہے	نہ الوداع کہا آپؐ کو آپؐ کے رب نے

وَمَا قَلٰى ؕ﴿۳﴾	وَلَلۡاٰخِرَةُ	خَيۡرٌ لَّكَ	مِنَ الۡاُوۡلٰى ؕ﴿۴﴾
اور نہ وہ بیزار ہوا (آپؐ سے)	اور یقیناً بعد میں آنے والی (حالت)	بہتر ہے آپؐ کے لیے	پہلی سے

وَلَسَوۡفَ يُعۡطِيۡكَ رَبُّكَ	فَتَرۡضٰى ؕ﴿۵﴾	اَلَمۡ يَجِدۡكَ	يَتِيۡمًا فَاٰوٰى ۪﴿۶﴾
اور یقیناً عنقریب عطا کرے گا آپؐ کو آپؐ کا رب	نتیجتاً آپؐ راضی ہو جائیں گے	کیا اس نے نہیں پایا آپؐ کو	یتیم تو اس نے رہنے کی جگہ دی (آپؐ کو)

وَوَجَدَكَ	ضَآلًّا	فَهَدٰى ۪﴿۷﴾	وَوَجَدَكَ عَآئِلًا
اور اس نے پایا آپؐ کو	راہ تلاش کرنے والا	تو اس نے رہنمائی کی (آپؐ کی)	اور اس نے پایا آپؐ کو تنگ دست

فَاَغۡنٰی ﴿۸﴾	فَاَمَّا	الۡیَتِیۡمَ فَلَا تَقۡهَرۡ ﴿۹﴾	وَاَمَّا بِنِعۡمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثۡ ﴿۱۱﴾
تو اس نے غنی کیا آپؐ کو)	پس وہ جو ہے، تو	کسی بھی یتیم کو پس آپؐ ذلیل مت کریں	اور وہ جو ہے، تو

السَّآئِلَ فَلَا تَنۡهَرۡ ﴿۱۰﴾	وَاَمَّا	بِنِعۡمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثۡ ﴿۱۱﴾
کسی بھی مانگنے والے کو پس آپؐ مت جھڑکیں	اور وہ جو ہے تو	اپنے رب کی نعمت کا آپؐ چرچا کریں

نوٹ:1

اس سورہ میں پہلے آفاق کے شواہد سے اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ جس طرح اس دنیا کی مادی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے دن کی حرارت و روشنی کی ضرورت ہے اور رات کی خنکی اور تاریکی کی بھی، اسی طرح انسانی فطرت کی مخفی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان کو تنگی اور آسانی، دکھ اور سکھ، رنج اور راحت، دونوں طرح کے حالات سے گزارا جائے۔ جو لوگ زندگی کی تربیت میں ان امتحانوں کا مقام سمجھتے ہیں اور ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں، ان کی اعلیٰ صلاحیتیں پروان چڑھتی ہیں اور جو لوگ ان امتحانوں کی حکمت سے ناوقف ہوتے ہیں یا اپنی کم ہمتی کی وجہ سے ان سے وہ فائدہ نہیں اٹھاتے جس کے لیے قدرت نے ان کو مقدر کیا ہے، وہ اپنے آپ کو اس مقام بلند سے محروم کر لیتے ہیں۔ جو اس امتحان سے گزرے بغیر انسان کو حاصل نہیں ہوتا۔ اس اصولی حقیقت کو بیان کرنے کے بعد نبی ﷺ کو خطاب کر کے تسلی دی ہے کہ جس امتحان سے آپ گزر رہے ہیں وہ خدا کی طرف سے کسی عتاب کے سبب پیش نہیں آیا ہے بلکہ یہ اسی امتحان کا ایک حصہ ہے جو انسان کی روحانی و اخلاقی تربیت کے لیے ضروری ہے۔ (تدبر قرآن)۔

نوٹ:2

روایات میں ہے کہ جبریلؑ دیر تک رسول اللہ ﷺ کے پاس نہ آئے، یعنی وحی قرآنی بند رہی تو مشرکین کہنے لگے کہ محمد (ﷺ) کو اس کے رب نے رخصت کر دیا۔ اس کے جواب میں یہ آیات نازل ہوئیں۔ لیکن میرا گمان یہ ہے کہ مخالفین نے اس وقت اس طرح کی باتیں کی ہوں جب سورۂ اِقرء کی ابتدائی آیات نازل ہونے کے بعد ایک طویل مدت تک وحی رکی رہی اور حضور ﷺ خود اس فترت (بندش) کے زمانے میں مضطرب رہے۔ یہاں تک کہ فرشتہ نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یٰۤاَیُّهَا الۡمُدَّثِّرُ کا خطاب سنایا۔ چنانچہ ابن کثیرؒ نے ابن اسحاق وغیرہ سے جو الفاظ نقل کیے ہیں وہ اسی احتمال کی تائید کرتے ہیں۔ ممکن ہے اسی دوران وہ قصہ بھی پیش آیا ہو جو بعض احادیث میں بیان ہوا ہے کہ ایک مرتبہ حضور ﷺ بیماری کی وجہ سے دو تین رات نہ اٹھ سکے تو ایک عورت کہنے لگی ''اے محمد معلوم ہوتا ہے تیرے شیطان نے تجھ کو چھوڑ دیا ہے۔'' (العیاذ باللہ)۔ غرض ان سب خرافات کا جواب اس سورہ میں دیا گیا ہے۔ (ترجمہ شیخ الہندؒ)

واضح رہے کہ مکی دور میں جب قریش کی مخالفت زیادہ شدت اختیار کر گئی تو اس سے آپ ﷺ کو خاص پریشانی جو ہوئی وہ یہی ہوئی کہ ہوسکتا ہے ان لوگوں کی اس بیزاری میں آپ ﷺ کی کسی کوتاہی یا بے تدبیری کا کوئی دخل ہو جو اللہ تعالیٰ کے عتاب کا سبب بنی ہے۔ جس کے باعث یہ حالات پیش آ رہے ہیں۔ اس پریشانی میں قدرتی طور پر آپ ﷺ کو وحی کا انتظار ہوتا کیونکہ یہی وہ واحد چیز ہے جو تاریک حالات میں روشنی بھی دکھا سکتی ہے اور اسی سے آپ ﷺ کو یہ اندازہ بھی ہوسکتا تھا کہ آپ ﷺ فریضۂ دعوت رب کی منشا کے مطابق انجام دے رہے ہیں یا نہیں۔ حضور ﷺ کی ان پریشانیوں کا ذکر مکی سورتوں میں جگہ جگہ ہوا ہے۔ اس آیت (نمبر 3) میں آپ ﷺ کو جو تسلی دی گئی ہے وہ ایسے ہی حالات میں دی گئی ہے۔ (تدبر قرآن)۔

نوٹ:3

آیت۔4۔ میں اٰخرۃ اور اُولیٰ کے الفاظ دنیا اور آخرت کے اصطلاحی مفہوم میں نہیں بلکہ عام مفہوم میں ہیں۔ یعنی دعوت کے آخری دور اور ابتدائی دور کے یا دعوت کے موجودہ دور اور اس کے مستقبل کے مفہوم میں استعمال ہوئے ہیں۔ اور یہ اسی تسلی کی مزید وضاحت ہے کہ اس وقت

جو حالات ہیں وہ بدل جائیں گے اور مستقبل موجودہ حال سے بہت بہتر ہوگا۔ قدیم صحیفوں میں آنحضرت ﷺ سے متعلق جو پیشن گوئیاں وارد ہوئی ہیں ان میں آپ ﷺ کی دعوت کے آغاز کو رائی کے دانے کی تمثیل سے سمجھایا ہے جو ہوتا تو نہایت چھوٹا ہے لیکن جب اُگتا ہے تو اس کا پودا سب ترکاریوں سے بڑا ہو جاتا ہے یہاں تک کہ پرندے اس میں بسیرا لیتے ہیں۔ (تدبر قرآن)۔

یہ خوشخبری اللہ تعالیٰ نے ایسی حالت میں دی تھی جبکہ مٹھی بھر آدمی آپ ﷺ کے ساتھ تھے، ساری قوم آپ ﷺ کی مخالف تھی اور بظاہر کامیابی کے آثار دور دور کہیں نظر نہ آتے تھے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ابتدائی دور کی مشکلات سے آپ ﷺ پریشان نہ ہوں۔ ہر بعد کا دور پہلے دور سے آپ ﷺ کے لیے بہتر ہوگا۔ آپ ﷺ کی قوت، عزت اور قدر و منزلت برابر بڑھتی چلی جائے گی اور آپ ﷺ کا نفوذ و اثر پھیلتا چلا جائے گا۔ اور اس میں یہ وعدہ بھی شامل ہے کہ آخرت میں جو مرتبہ آپؐ کو ملے گا وہ اُس مرتبہ سے بدرجہا بڑھ کر ہوگا جو دنیا میں آپ ﷺ کو حاصل ہوگا۔ ایک حدیث میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ میرے سامنے وہ تمام فتوحات پیش کی گئیں جو میرے بعد میری اُمت کو حاصل ہونے والی ہیں۔ اس پر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا کہ آخرت تمہارے لیے دنیا سے بھی بہتر ہے۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ: 4 آیت۔ 5۔ کا مطلب ہے کہ آپ ﷺ کا رب آپ ﷺ کو اتنا دے گا کہ آپ ﷺ راضی ہو جائیں گے۔ اس میں حق تعالیٰ نے یہ متعین کر کے نہیں بتایا کہ کیا دیں گے۔ اس میں اشارہ عموم کی طرف ہے کہ آپ ﷺ کی ہر مرغوب چیز آپ ﷺ کو اتنی دیں گے کہ آپ ﷺ راضی ہو جائیں۔ آپ ﷺ کی مرغوب چیزوں میں اُمت کی ہر ضرورت، زمین میں اللہ کا کلمہ بلند کرنا اور دینِ حق پھیلانا سب داخل ہیں۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ میری اُمت کے بارے میں میری شفاعت قبول فرمائیں گے یہاں تک کہ حق تعالیٰ فرمائیں گے اے محمد (ﷺ) اب آپ راضی ہیں، تو میں عرض کروں گا اے میرے پروردگار میں راضی ہوں۔ ایک دوسری حدیث میں ہے کہ ایک روز رسول اللہ ﷺ نے وہ آیت تلاوت فرمائی جو حضرت ابراہیمؑ سے متعلق ہے۔ ﴿فَمَنۡ تَبِعَنِیۡ فَاِنَّہٗ مِنِّیۡ ۚ وَ مَنۡ عَصَانِیۡ فَاِنَّکَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۳۶﴾ (سورہ ابراہیم: 36) پھر دوسری آیت تلاوت فرمائی جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول ہے ﴿اِنۡ تُعَذِّبۡہُمۡ فَاِنَّہُمۡ عِبَادُکَ ۚ﴾ (المائدہ۔ 118)

پھر آپ ﷺ نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے۔ آپ ﷺ روتے رہے اور بار بار فرماتے تھے اَللّٰھُمَّ اُمَّتِیۡ اُمَّتِیۡ۔ اللہ تعالیٰ کے حکم پر جبریلؑ تشریف لائے اور پوچھا کہ آپؐ کیوں روتے ہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں اپنی اُمت کی مغفرت چاہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے جبریلؑ سے فرمایا کہ جاؤ اور کہہ دو کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم آپ ﷺ کو آپ ﷺ کی اُمت کے بارے میں راضی کر دیں گے۔ (معارف القرآن)۔

نوٹ: 5 آنحضرت ﷺ کی ولادت سے پہلے ہی آپ ﷺ کے والد وفات پا چکے تھے۔ چھ سال کی عمر تھی کہ والدہ نے رحلت کی پھر آٹھ سال کی عمر تک اپنے دادا عبدالمطلب کی کفالت میں رہے۔ آخر میں ظاہری تربیت و پرورش کی سعادت آپ ﷺ کے چچا ابو طالب کے حصے میں آئی۔ انہوں نے زندگی بھر آپ ﷺ کی نصرت و حمایت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ ہجرت سے کچھ پہلے وہ بھی دنیا سے رخصت ہوئے۔ پھر یہ امانت الٰہی اللہ کے حکم سے انصارِ مدینہ کے گھر پہنچ گئی۔ اوس اور خزرج کی قسمت کا ستارہ چمک اٹھا اور انہوں نے اس کی حفاظت اس طرح کی جس کی نظر چشمِ فلک نے کبھی نہ دیکھی ہوگی۔ یہ سب صورتیں درجہ بدرجہ فَاٰوٰی کے تحت میں داخل ہیں۔ (ترجمہ شیخ الہندؒ)

نوٹ: 6 یہ بات معلوم ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو جو رسوم و روایات خاندان کے بزرگوں سے ملیں ان پر آپ ﷺ کی سلیم

فطرت مطمئن نہ ہوسکی اور دوسری کوئی ایسی روشنی تھی نہیں جو آپ ﷺ کے لیے سرمایہ تسکین بنتی۔ آسمانی مذاہب کے پیروکار جو آپ ﷺ کے اردگرد تھے ان کے عقائد واعمال اس قدر مسخ ہو چکے تھے کہ کوئی حقیقت کو تلاش کرنے والا ان سے کوئی رہنمائی حاصل نہیں کرسکتا تھا۔ اس صورتِ حال نے آپ ﷺ کو ذہنی کشمکش میں ڈال دیا تھا۔ آپ ﷺ کی اسی کشمکش کو آیت۔7۔ میں وَوَجَدَكَ ضَآلًّا کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ انبیاء علیہم السلام بعثت سے پہلے بھی فطرت سلیم پر ہوتے ہیں۔ لیکن فطرت عقائد واعمال کی موٹی موٹی باتوں ہی میں رہنمائی کرتی ہے لیکن عقائد واعمال کے تمام لوازمات کی وہ تشریح نہیں کرسکتی۔ اس وجہ سے فطرت پر ہونے کے باوجود ایک شخص یہ جاننے کا محتاج رہتا ہے کہ جس خدا کے وجود پر اس کا دل گواہی دے رہا ہے اس کی صفات کیا ہیں اور ان صفات کے تقاضے کیا ہیں۔ اس کے کیا حقوق بندے پر عائد ہوتے ہیں اور وہ کس طرح ادا کرنے ہیں۔ زندگی کی ایک ضابطہ بندی کس طرح کی جائے کہ وہ پوری کی پوری خالق کی پسند کے مطابق ہوجائے یہی سوالات ہیں جو نبی ﷺ کے دل پر زندگی کے اس دور میں مستولی تھے جس کی طرف وَوَجَدَكَ ضَآلًّا کے الفاظ اشارہ کررہے ہیں۔ بعثت سے پہلے غارِ حرا کی تنہائیوں میں آپ ﷺ انہی گتھیوں کو سلجھانے میں گم رہے۔

رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے عرب میں دین حنیفی کے پیروکاروں کا حال کتابوں میں اس طرح بیان ہوا ہے کہ ان میں سے بعض افراد ایسی شدید الجھن میں مبتلا تھے کہ وہ بیت اللہ سے ٹیک لگا کر حرم میں بیٹھ جاتے تھے اور نہایت حسرت کے ساتھ کہتے تھے کہ اے رب ہم نہیں جانتے کہ تیری عبادت کس طرح کریں ورنہ اسی طرح کرتے۔ یہی حال اس وقت تک نبی ﷺ کا بھی رہا ہوگا جب تک آپ ﷺ کتاب سے روشناس نہیں ہوئے۔ چنانچہ سورۂ شوریٰ کی آیت۔52۔ میں اسی حالت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ''اور اسی طرح ہم نے تمہاری طرف ایک روح وحی کی جو ہمارے امر میں سے ہے۔ نہ تم کتاب سے آشنا تھے اور نہ ایمان سے لیکن ہم نے اس وحی کو روشنی بنایا جس سے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں راہ دکھاتے ہیں۔'' (تدبر قرآن)۔

نوٹ:7

آیت۔10۔ کے دو معنی ہیں۔ اگر سائل کو مدد مانگنے والے حاجت مند کے معنی میں لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر مدد کرسکتے ہو تو کردو، ورنہ نرمی کے ساتھ معذرت کرلو، مگر بہرحال اسے جھڑکو نہیں۔ اور اگر سائل کو پوچھنے والے کے معنی میں لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ پوچھنے والا خواہ کیسا ہی جاہل اور اُجڈ ہو اور خواہ کتنے ہی نامعول طریقے سے سوال کرے، بہرحال اسے شفقت کے ساتھ جواب دو اور علم کا زعم رکھنے والے بدمزاج لوگوں کی طرح اسے جھڑک کر دور مت کرو۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ:8

نعمت کا لفظ عام ہے۔ اس سے مراد وہ نعمتیں بھی ہیں جو اس سورہ کے نزول تک اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو عطا فرمائی تھیں اور وہ نعمتیں بھی جو بعد میں عطا کیں۔ پھر حکم یہ ہے کہ اے نبی ﷺ ہر نعمت جو اللہ نے تم کو دی ہے اس کا ذکر اور اس کا اظہار کرو۔ اب یہ ظاہر بات ہے کہ ہر نعمت اپنی نوعیت کے لحاظ سے اظہار کی ایک صورت چاہتی ہے۔ مجموعی طور پر تمام نعمتوں کے اظہار کی صورت یہ ہے کہ زبان سے اللہ کا ذکر ادا کرے اور اس بات کا اقرار واعتراف کرے کہ جو نعمتیں بھی مجھے حاصل ہیں یہ سب اللہ کا فضل واحسان ہیں اور کوئی چیز بھی میرے کسی ذاتی کمال کا نتیجہ نہیں ہے۔ نعمت نبوت کا اظہار یہ ہے کہ دعوت وتبلیغ کا حق ادا کیا جائے۔ نعمت قرآن کا اظہار یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ اس کی اشاعت کی جائے اور اس کی تعلیمات لوگوں کے ذہن نشین کی جائیں۔ نعمت ہدایت کا اظہار یہ ہے کہ اللہ کی بھٹکی ہوئی مخلوق کو سیدھا راستہ بتایا جائے اور اس کام کی ساری تلخیوں اور ترشیوں کو صبر کے ساتھ برداشت کیا جائے۔ الغرض یہ ایک بڑی جامع ہدایت تھی جو اللہ تعالیٰ نے اس مختصر سے فقرے میں دی۔ (تفہیم القرآن)۔

ہر نعمت کا شکر ادا کرنا واجب ہے۔ مالی نعمت کا شکر یہ ہے کہ اس مال میں سے کچھ اللہ کے لیے اخلاص نیت کے ساتھ خرچ کرے۔ نعمت بدن کا شکر یہ ہے کہ جسمانی طاقت کو اللہ تعالیٰ کے واجبات ادا کرنے میں صرف کرے۔ علم و معرفت کا شکر یہ ہے کہ دوسروں کو اس کی تعلیم دے۔ (معارف القرآن)۔

نوٹ:9

سورۂ والضحیٰ سے آخر قرآن تک ہر سورت کے ساتھ تکبیر کہنا سنت ہے۔ اس تکبیر کے الفاظ شیخ صالح مصری نے لَا اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ بتلائے ہیں۔ ابن کثیر نے ہر سورت کے ختم پر بغوی نے ہر سورت کے شروع میں ایک مرتبہ تکبیر کہنے کو سنت کہا ہے۔ دونوں میں جو صورت بھی اختیار کرے سنت ادا ہو جائے گی۔

سورۂ ضحیٰ سے آخر قرآن تک بیشتر سورتوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر حق تعالیٰ کے خاص انعامات اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مخصوص فضائل کا ذکر ہے اور چند سورتوں میں قیامت اور اس کے احوال کا۔ قرآن حکیم کا شروع خود قرآن کی عظمت اور ناقابل شک وشبہہ ہونے سے کیا گیا اور ختم قرآن اس ذات کی عظمت وشان پر کیا گیا جس پر قرآن نازل ہوا۔ (معارف القرآن)۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سورۃ الم نشرح (94)

آیت نمبر (1 تا 8)

ترجمہ

اَلَمْ نَشْرَحْ	لَكَ صَدْرَكَ ۙ﴿۱﴾	وَوَضَعْنَا	عَنْكَ وِزْرَكَ ۙ﴿۲﴾
کیا ہم نے کھول نہیں دیا	آپؐ کے لیے آپؐ کے سینے کو	اور ہم نے اتارا	آپؐ سے آپؐ کے بوجھ کو

الَّذِيْٓ اَنْقَضَ	ظَهْرَكَ ۙ﴿۳﴾	وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ؕ﴿۴﴾
وہ (بوجھ) جس نے ٹوٹنے کے قریب کیا	آپؐ کی پیٹھ کو	اور ہم نے بلند کیا آپؐ کے لیے آپؐ کے ذکر کو

فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۙ﴿۵﴾	اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ؕ﴿۶﴾	فَاِذَا فَرَغْتَ
پس یقیناً سختی کے ساتھ ایک نرمی ہے	بیشک مشکل کے ساتھ آسانی ہے	پھر جب آپؐ فارغ ہوں

فَانْصَبْ ۙ﴿۷﴾	وَاِلٰى رَبِّكَ	فَارْغَبْ ﴿۸﴾
تو آپؐ کوشش کریں	اور اپنے رب کی طرف ہی	پھر آپؐ التجا کریں

نوٹ:1

شرح صدر (سینہ کھولنے) کا لفظ قرآن میں جن مواقع پر آیا ہے ان پر نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دو معنی ہیں۔ ایک یہ کہ ہر قسم کے ذہنی خلجان اور تردد سے پاک ہو کر اس بات پر مطمئن ہو جانا کہ اسلام کا راستہ ہی برحق ہے۔ دوسرا یہ کہ نبوت کی عظیم ذمہ داریاں سنبھالنے کی اس میں ہمت پیدا ہو جائے۔ مثلاً سورۂ انعام۔ آیت۔125۔ میں ہے کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ ہدایت بخشنے کا ارادہ فرماتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے۔ یہاں یہ لفظ پہلے معنی میں ہے۔ جبکہ سورۂ طٰہٰ۔ آیات۔25۔26۔ میں ہے کہ نبوت ملنے کے موقعہ پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا مانگی تھی کہ اے میرے رب میرا سینہ میرے لیے کھول دے اور میرا کام میرے لیے آسان کر دے۔

یہاں یہ دوسرے معنی میں ہے غور کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ اس سورہ کی پہلی آیت میں رسول اللہ ﷺ کا سینہ کھول دینے سے یہ دونوں معنی مراد ہیں۔(تفہیم القرآن)۔

نوٹ:2

وِزْرَ سے مراد غم کا بوجھ ہے جو بعثت سے پہلے آپ ﷺ کے دل پر اس سبب سے تھا کہ آپ ﷺ حقیقت کی تلاش میں سرگرداں تھے لیکن اس کا کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔ پھر جب اللہ نے آپ ﷺ پر ہدایت کی راہ کھول دی تو اس غم پر مزید اضافہ اس سبب سے ہوا کہ آپ ﷺ کی پوری قوم دشمن بن کر کھڑی ہوگئی۔ اور توقع کے خلاف جب آپ ﷺ نے دیکھا کہ جتنی دعوت کی راہ میں آپ ﷺ کی سرگرمی بڑھتی جارہی تھی اتنی ہی لوگوں کی مخالفت میں اضافہ ہوتا جارہا تھا، تو قدرتی طور پر آپ ﷺ کو یہ گمان گزرا کہ شاید آپ ﷺ کی جدو جہد میں کہیں کوئی کمی ہے۔ علاوہ ازیں اس طرح کے حالات میں اگر وحی کے آنے میں کچھ وقفہ ہو جاتا تو یہ وقفہ بھی آپ ﷺ کی پریشانی میں اضافہ کر دیتا۔ حضور ﷺ کی ان پریشانیوں کو دور کرنے کے لیے جس طرح پچھلی سورہ میں تسلی دی گئی ہے اسی طرح یہاں بھی دی گئی ہے۔(تدبر قرآن)۔

نوٹ:3

رسول اللہ ﷺ کا ذکر بلند کرنے کی بات اس زمانے میں فرمائی گئی تھی جب کوئی یہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ جس کے ساتھ گنتی کے چند آدمی ہیں اور وہ بھی صرف شہر مکہ تک محدود ہیں اس کا ذکر دنیا بھر میں کیسے بلند ہوگا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان ہی حالات میں یہ خوشخبری سنائی اور پھر عجیب طریقہ سے اسے پورا کیا۔ سب سے پہلے اس نے آپ ﷺ کے رفع ذکر کا کام خود آپ ﷺ کے دشمنوں سے لیا۔ حج کے موقع پر جب تمام عرب سے لوگ ان کے شہر میں آتے تھے، اس زمانے میں کفار مکہ کے وفود حاجیوں کے ڈیرے پر جاتے اور لوگوں کو خبردار کرتے کہ یہاں ایک شخص ہے جو لوگوں پر جادو کرتا ہے تو باپ بیٹے، بھائی بھائی اور شوہر بیوی میں جدائی پڑ جاتی ہے۔ اس لیے اس سے بچ کے رہنا۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ عرب کے گوشے گوشے میں آپ ﷺ کا نام پہنچ گیا۔ اس کے بعد ہجرت سے دوسرے مرحلے کا آغاز ہوا جس میں منافقین، یہود اور تمام عرب کے مشرکین آپ ﷺ کو بدنام کرنے میں سرگرم تھے۔ دشمنوں نے جنگ سے حضور ﷺ کے اثر کو مٹانے کی کوشش کی مگر آپ ﷺ کی قیادت میں اہل ایمان کی جو جماعت تیار ہوئی تھی اس نے نظم وضبط، شجاعت اور اخلاقی حدود کی پابندی سے اپنی برتری ثابت کر کے سارے عرب سے اپنا لوہا منوالیا۔ اور دس سال کے اندر اندر حضور ﷺ کا رفع ذکر اس طرح ہوا کہ عرب کا گوشہ گوشہ کلمہ شہادت کی صدا سے گونج اٹھا۔

پھر تیسرے مرحلے کا آغاز خلافتِ راشدہ کے دور سے ہوا جب آپ ﷺ کا نام مبارک تمام روئے زمین میں بلند ہونا شروع ہوا۔ یہ سلسلہ آج تک بڑھتا ہی جارہا ہے اور انشاء اللہ قیامت تک بڑھتا چلا جائے گا۔ دنیا میں کوئی جگہ ایسی نہیں ہے جہاں مسلمانوں کی کوئی بستی موجود ہو اور دن میں پانچ مرتبہ اذان میں آپ ﷺ کی رسالت کا اعلان نہ ہو رہا ہو، نمازوں میں آپ ﷺ پر درود نہ بھیجا جارہا ہو، جمعہ کے خطبوں میں آپ ﷺ کا ذکرِ خیر نہ ہو۔ سال کے بارہ مہینوں میں سے کوئی دن، اور دن کے 24 گھنٹوں میں سے کوئی وقت ایسا نہیں ہے جب روئے زمین میں کسی نہ کسی جگہ آپ ﷺ کا ذکر نہ ہو رہا ہو۔ نبوت کے ابتدائی دور میں جس وقت اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ اس وقت کوئی بھی یہ اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ یہ رفع ذکر اس شان سے اور اتنے بڑے پیمانے پر ہوگا۔ یہ قرآن کی صداقت کا ایک اور کھلا ہوا ثبوت ہے۔(تفہیم القرآن)

نوٹ:4 آیات۔5۔6۔ سے پہلے جو باتیں کہی گئیں ہیں وہ رسول اللہ ﷺ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہیں۔ہم نے آپ ﷺ کے لیے آپ ﷺ کا سینہ کھولا۔آپ ﷺ سے آپ ﷺ کا بوجھ ہٹایا۔آپ ﷺ کے لیے آپ ﷺ کا ذکر بلند کیا۔لیکن ان آیات میں یہ نہیں کہا کہ آپ ﷺ کی مشکل کے ساتھ آسانی ہے، بلکہ بات کو عمومی انداز میں کہا گیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ یہ دراصل آفاقی صداقت (Classical Truth) کا بیان ہے یہ ایک ایسا قاعدہ ہے جو رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے بھی رائج تھا۔البتہ حیاتِ طیبہ کے دوران وہ اپنے عروج کو پہنچ گیا۔لیکن اس کے بعد یہ قاعدہ ختم نہیں ہوگیا۔ بلکہ آج بھی ہلکے پیمانے پر جاری ہے۔اور مومن۔مسلم۔کافر۔دہریہ سب کی زندگی میں اس کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔(مرتب)۔اب اگر دنیا میں کسی شخص کو عُسر کے بعد یُسر نصیب نہ ہو تو وہ اس آیت کے منافی نہیں ہے۔البتہ عادۃُ اللہ اب بھی یہی ہے کہ جو شخص سختی پر صبر کرے اور آسانی میں دیر ہونے سے آس نہ توڑ بیٹھے تو ضرور اللہ تعالیٰ اس کے حق میں آسانی کردے گا۔بعض روایات حدیث میں بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔(معارف القرآن)

یہاں اس پہلو پر بھی نظر رہے کہ ایک ہی بات دو مرتبہ فرمائی گئی ہے۔ یہ تکرار محض تاکید کے لیے نہیں ہے، بلکہ اس سے مقصود اس حقیقت کا اظہار ہے کہ یہ عُسر اور یُسر دنیا میں لازم وملزوم ہیں۔ایک گھاٹی کسی نے پار کرلی تو وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ بس اب کسی گھاٹی سے اس کو سابقہ نہیں پیش آنا ہے بلکہ دوسری اور تیسری گھاٹی بھی آسکتی ہے۔ چاہیے کہ ان کو عبور کرنے کا حوصلہ بھی قائم رکھے۔ زندگی مسلسل جدوجہد سے عبارت ہے۔اس جہاں میں ہر مسافر کو نشیب وفراز سے سابقہ پیش آتا ہے اور ان سے گزرنے کے بعد ہی کوئی مسافر منزل مقصود پر پہنچتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہی معاملہ حق کے راستے پر چلنے والوں سے بھی ہے۔ جو لوگ اس راستہ پر چلنے کا ارادہ کرتے ہیں ان کے لیے یہ نہیں ہوتا کہ راستے کی تمام مشکلات خود بخود دور ہوجائیں، بلکہ ان کو دور کرنے کے لیے خود ان کو جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔البتہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے لیے یہ ضمانت ضرور ہے کہ اگر وہ راہ کی رکاوٹوں سے ہمت نہیں ہاریں گے تو وہ ان کے لیے ہر مشکل کے بعد آسانی پیدا کرے گا۔جس سے تازہ دم ہو کر وہ آگے کے سفر کے لیے مزید عزم وحوصلہ کرلیں گے۔اس طرح ایک کے بعد دوسری مشکل سے لڑتے اور اس کو سر کرتے ہوئے بالآخر منزل مطلوب پر پہنچ جائیں گے۔(تدبر قرآن)

نوٹ:5 آیات۔7۔8۔کا مطلب یہ ہے کہ جب آپ ﷺ دعوت حق اور تبلیغ احکام سے فارغ ہوں تو دوسری محنت کے لیے تیار ہوجایئے۔وہ یہ کہ نماز، ذکر اللہ اور دعا واستغفار میں لگ جائیں۔اس کا حاصل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی دعوت وتبلیغ، خلق خدا کو راستہ دکھانا اور ان کی اصلاح کی فکر، یہ آپ ﷺ کی سب سے بڑی عبادت تھی۔مگر یہ عبادت بواسطہ مخلوق تھی۔آیت کا مقصود یہ ہے کہ اسی عبادت بالواسطہ پر آپ ﷺ قناعت نہ کریں، بلکہ جب اس سے فرصت ملے خلوت میں بلاواسطہ حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوں اور اسی سے کام میں کامیابی کی دعا کریں۔ اصل مقصود جس کے لیے انسان پیدا کیا گیا ہے وہ عبادت بلاواسطہ ہی ہے۔شاید اسی لیے عبادت بالواسطہ سے فراغت کا ذکر فرمایا کہ وہ کام ایک ضرورت کے لیے ہے، اس سے فراغت ہوسکتی ہے اور توجہ الی اللہ ایسی چیز ہے کہ اس سے فراغت مومن کو کبھی نہیں ہوسکتی۔اس سے معلوم ہوا کہ تعلیم وتبلیغ کا کام کرنے والوں کو اس سے غافل نہیں ہونا چاہیے اور کچھ وقت توجہ الی اللہ کے لیے بھی مخصوص ہونا چاہیے۔اس کے بغیر تبلیغ مؤثر نہیں ہوتی اور اس میں نور وبرکت نہیں ہوتی۔(معارف القرآن)

2029

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ التین (95)

آیت نمبر (1 تا 8)

ترجمہ

وَالتِّیۡنِ وَالزَّیۡتُوۡنِ ۙ﴿۱﴾	وَطُوۡرِ سِیۡنِیۡنَ ۙ﴿۲﴾	وَہٰذَا الۡبَلَدِ الۡاَمِیۡنِ ۙ﴿۳﴾
قسم ہے انجیر کی اور قسم ہے زیتون کی	اور قسم ہے سینین کی (کوہِ) طور کی	اور قسم ہے اس امن والے شہر کی

لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ	فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ ۫﴿۴﴾	ثُمَّ رَدَدۡنٰہُ
بیشک ہم نے پیدا کیا انسان کو	بہترین تعدیل وتناسب میں	پھر ہم نے لوٹایا اس کو

اَسۡفَلَ سٰفِلِیۡنَ ۙ﴿۵﴾	اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا	وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
پست ہونے والوں کا سب سے پست	سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے	اور انہوں نے عمل کیے نیکیوں کے

فَلَہُمۡ اَجۡرٌ	غَیۡرُ مَمۡنُوۡنٍ ؕ﴿۶﴾	فَمَا یُکَذِّبُکَ	بَعۡدُ
تو ان کے لیے ایک ایسا اجر ہے جو	غیر منقطع ہے	تو کیا چیز (دلیل) جھٹلا سکتی ہے آپ کو	اس کے بعد

بِالدِّیۡنِ ؕ﴿۷﴾	اَلَیۡسَ اللّٰہُ	بِاَحۡکَمِ الۡحٰکِمِیۡنَ ﴿۸﴾
بدلے کے بارے میں	کیا اللہ نہیں ہے	تمام حاکموں کا سب سے بڑا حاکم

نوٹ:1

پہلی آیت کی تفسیر میں ایک رائے یہ ہے کہ انجیر سے مراد یہی انجیر ہے جسے لوگ کھاتے ہیں اور زیتون سے مراد یہی زیتون ہے جس سے تیل نکالا جاتا ہے اس میں شک نہیں کہ ایک عام عربی دان ان الفاظ کو سُن کر یہی معنی لے گا۔ لیکن دو وجوہ ایسے ہیں جو یہ معنی لینے میں رکاوٹ ہیں۔ ایک یہ کہ آگے طور سینا اور شہر مکہ کی قسم کھائی گئی ہے اور دو پھلوں کے ساتھ دو مقامات کی قسم کھانے میں کوئی مناسبت نظر نہیں آتی۔ دوسرے ان چار چیزوں کی قسم کھا کر آگے جو مضمون بیان کیا گیا ہے اس طور سینا اور شہر مکہ تو دلالت کرتے ہیں لیکن یہ دو پھل اس پر دلالت نہیں کرتے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ تین سے مراد دمشق کا شہر ہے اور زیتون سے مراد بیت المقدس ہے۔ یہ الفاظ سُن کر یہ معنی ایک عام عرب کے ذہن میں نہیں آسکتے کیونکہ اہل عرب میں یہ بات معروف نہیں تھی کہ تین اور زیتون ان مقامات کے نام ہیں۔

البتہ یہ طریق اہلِ عرب میں رائج تھا کہ جو پھل کسی علاقے میں کثرت سے پیدا ہوتا ہو اس علاقے کو بسا اوقات اس پھل کے نام سے موسوم کر دیتے تھے۔ اس محاورے کے لحاظ سے تین اور زیتون کے الفاظ کا مطلب ان کی پیداوار کا علاقہ ہوسکتا ہے۔ اور وہ ملک شام اور ملک فلسطین کا علاقہ ہے کیونکہ اس زمانے میں یہی علاقہ ان کی پیداوار کے لیے مشہور تھا۔ (تفہیم القرآن)۔

اس طرح ان قسموں میں وہ تمام مقاماتِ مقدسہ شامل ہوگئے جہاں خاص خاص انبیاءؑ پیدا اور مبعوث ہوئے ملک شام عام انبیاءؑ کا وطن ہے۔ کوہ طور حضرت موسیٰؑ کے حق تعالیٰ سے ہم کلام ہونے کی جگہ ہے۔ جبکہ سینین یا سینا اس مقام کا نام ہے جہاں یہ پہاڑ واقع ہے۔ اور مکہ مکرمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مسکن ہے۔ (معارف القرآن)

نوٹ:2

چار چیزوں کی قسم کھا کر فرمایا کہ ہم نے انسان کو بہترین تقویم پر پیدا کیا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اس کی جبلت وفطرت کو بھی دوسری مخلوقات کے

اعتبار سے احسن بنایا گیا ہے۔اوراس کی جسمانی ہیئت اور شکل وصورت کو بھی دوسرے جانداروں سے بہتر اور حسین بنایا گیا ہے۔ابن عربی نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں کوئی انسان سے احسن نہیں کیونکہ اس کو اللہ تعالیٰ نے حیات کے ساتھ عالم۔قادر۔متکلم۔سمیع۔بصیر۔مدبر اور حکیم بنایا ہے اور یہ سب صفات دراصل خود اللہ تعالیٰ کی ہیں۔چنانچہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو اپنی صورت پر پیدا فرمایا ہے۔مراد اس سے یہی ہوسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بعض صفات کا کوئی درجہ اس کو بھی دیا گیا ہے۔ورنہ حق تعالیٰ ہر شکل وصورت سے بَری ہے۔(معارف القرآن)

تقویم کے بنیادی معنی کسی چیز کو سیدھا کرنے کے ہیں۔سیدھی کی ہوئی چیز میں حسن اس وقت پیدا ہوتا ہے جب اس کی لمبائی اور چوڑائی میں ایک اعتدال اور تناسب ہو۔خطاطی کے ماہر فن لوگ اگر الف لکھیں گے تو اس کی لمبائی اور موٹائی کے تناسب کا لحاظ رکھیں گے،اسی طرح الفاظ کے تمام حروف کے قدوکاٹھ میں اعتدال اور تناسب کا لحاظ رکھا جائے گا۔جو خطاط جتنا مناسب اعتدال وتناسب قائم کرلیتا ہے اس کی خطاطی دیکھنے میں اتنی ہی خوبصورت ہوتی ہے۔(حافظ احمد یار صاحب کے کیسٹ سے ماخوذ)۔اس بات کو ذہن میں رکھ کر جب ہم غور کرتے ہیں تو بات سمجھ میں آتی ہے انسان کی جسمانی ساخت میں اس کی صلاحیتوں میں اور اس کی استعداد میں جبر وقدر کا ایک بڑا عجیب توازن کا امتزاج نظر آتا ہے۔ہماری آنکھ دیکھ سکتی ہے،کان سن سکتے ہیں لیکن ان کی یہ استعداد لامحدود نہیں ہے۔ایک خاص فاصلہ سے آگے کی آواز ہمارے کان نہیں سن سکتے۔جبکہ اس فاصلے پر موجود چیزوں کو آنکھ دیکھ سکتی ہے لیکن ایک حد سے آگے آنکھ بھی نہیں دیکھ سکتی۔ہم کو نفس امارہ دیا گیا ہے تو ساتھ ہی نفس لوامہ بھی دیا گیا ہے۔اس انداز میں انسان کی فطرت وجبلت پر غور کریں تو ہر جگہ ہمیں توازن،اعتدال اور تناسب کا ایک حسین امتزاج نظر آتا ہے۔دوسری مخلوقات کو یہ حسن اتنا نہیں دیا گیا جتنا انسان کو دیا گیا ہے۔(مرتب)۔

نوٹ:3

اس کے آگے۔۵۔میں فرمایا کہ پھر ہم نے اس کو لوٹا دیا پست ترین لوگوں میں۔یہ مفہوم بھی لیا جاسکتا ہے کہ پست ترین مخلوق میں یعنی درندوں سے بھی بدتر۔(مرتب)۔مفسرین نے عام طور پر اس آیت کے دو معنی بیان کیے ہیں۔ایک یہ کہ ہم نے اسے ارذل العمر یعنی بڑھاپے کی ایسی حالت کی طرف پھیر دیا جس میں وہ کچھ سوچنے اور کام کرنے کے قابل نہ رہا۔دوسرے یہ کہ ہم نے اسے جہنم کے سب سے نیچے درجے کی طرف پھیر دیا۔لیکن اس سورہ کا مقصود جزا وسزا کے برحق ہونے پر استدلال کرنا ہے۔اس لیے یہ دونوں معنی اس مقصود کلام کے لیے دلیل نہیں بنتے۔ہمارے نزدیک آیت کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ بہترین ساخت پر پیدا کیے جانے کے بعد انسان اپنے جسم اور ذہن کی طاقتوں کو بُرائی کے راستے میں استعمال کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے برائی ہی کی توفیق دیتا ہے اور گراتے گراتے اسے گراوٹ کی اس انتہا تک پہنچا دیتا ہے کہ کوئی مخلوق گراوٹ میں اس حد کو پہنچی ہوئی نہیں ہوتی۔یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو انسانی معاشرے کے اندر بکثرت مشاہدے میں آتی ہے۔(تفہیم القرآن)۔

اس آیت میں ثُمَّ رَدَدْنٰهُ کے الفاظ آئے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ لوٹانے کے عمل کو اللہ تعالیٰ اپنی طرف منسوب کر رہا ہے لیکن ذمہ دار انسان ہے۔یہ وہی اندازِ کلام ہے جو قرآن میں جابجا استعمال ہوا ہے اور سب سے پہلے خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ والی آیت میں آیا تھا۔وہیں پر اس کی وضاحت کردی گئی ہے۔(دیکھیں آیت۔2/البقرۃ:7،نوٹ۔4)(مرتب)۔

نوٹ: 4

آیت۔7۔8 کا مفہوم یہ ہے کہ بہترین ساخت پر پیدا کیے ہوئے انسانوں میں سے ایک گروہ اعمالِ بد اختیار کرنے کے نتیجے میں اخلاقی پستیوں میں گرتے گرتے سب نیچوں سے بھی نیچے چلا جاتا ہے اور دوسرا گروہ اعمال صالح اختیار کرنے کے نتیجے میں اسی حالت پر قائم رہتا ہے جو بہترین ساخت پر انسان کو پیدا کرنے سے مطلوب تھی۔ اس کے بعد بدلے کو کیسے جھٹلایا جا سکتا ہے۔ کیا عقل یہ کہتی ہے کہ دونوں قسم کے انسانوں کا انجام یکساں ہو۔ جب دنیا کے چھوٹے چھوٹے حاکموں سے تم یہ چاہتے ہو کہ وہ انصاف کریں، مجرموں کو سزا دیں اور اچھے کام کرنے والوں کو انعام دیں، تو خدا کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا وہ سب حاکموں سے بڑا حاکم نہیں ہے؟ تو کیا اس کے بارے میں تمہارا خیال ہے کہ وہ انصاف نہیں کرے گا؟ کیا وہ بُرے اور بھلے کو ایک جیسا کر دے گا۔ (تفہیم القرآن)۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ العلق (96)

آیت نمبر (1 تا 5)

اِقۡرَاۡ	بِاسۡمِ رَبِّكَ الَّذِىۡ	خَلَقَ ۚ ﴿۱﴾	خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ
آپؐ پڑھیئے	اپنے اس رب کے نام کے ساتھ جس نے	پیدا کیا (ہر چیز کو)	اس نے پیدا کیا انسان کو

مِنۡ عَلَقٍ ۚ ﴿۲﴾	اِقۡرَاۡ	وَ رَبُّكَ الۡاَكۡرَمُ ۙ ﴿۳﴾	الَّذِىۡ عَلَّمَ	بِالۡقَلَمِ ۙ ﴿۴﴾
ایک چمٹے ہوئے خون سے	آپؐ پڑھیئے	اور آپؐ کا رب ہی سب سے زیادہ کریم ہے	وہ، جس نے علم دیا	قلم کے ذریعہ سے

عَلَّمَ الۡاِنۡسَانَ	مَا	لَمۡ يَعۡلَمۡ ؕ ﴿۵﴾
اس نے علم دیا انسان کو	اس کا جس کو	اس نے جانا ہی نہیں

نوٹ: 1

علماء کی اکثریت کا اتفاق ہے کہ وحی کی ابتدا سورۃ علق کی ابتدائی پانچ آیات سے ہوئی ہے۔ بعض حضرات نے سورۂ مدثر کو اور بعض نے سورۂ فاتحہ کو پہلی سورت قرار دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سورۂ علق کی پانچ آیات نازل ہونے کے بعد نزولِ قرآن کچھ عرصہ تک موقوف رہا۔ اس کے بعد پھر اچانک حضرت جبرئیل علیہ السلام سامنے آئے اور سورۂ مدثر کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں۔ اس وقت بھی رسول اللہ ﷺ پر وہی کیفیت طاری ہوئی جو سورۂ علق کے نزول کے وقت پیش آئی تھی۔ اس لحاظ سے اس کو بعض حضرات نے پہلی سورت کہا ہے۔ ۹ اور سورۂ فاتحہ کو پہلی سورت کہنے کی وجہ یہ ہے کہ مکمل سورت سب سے پہلے سورۂ فاتحہ ہی نازل ہوئی ہے، اس سے پہلے چند سورتوں کی متفرق آیات ہی کا نزول ہوا تھا۔

ایک طویل حدیث میں وحی کی ابتدا کا واقعہ بیان ہوا ہے۔ (اس حدیث کی تفصیل تفاسیر میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ ہم صرف اس کے اہم نکات درج کر رہے ہیں۔ مرتب) سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ پر وحی کا سلسلہ سچے خوابوں سے شروع ہوا۔ اس کے بعد آپ ﷺ میں خلوت میں عبادت کرنے کا داعیہ پیدا ہوا۔ یہ عبادت لوگوں سے الگ ہو کر اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ خاص اور تفکر کی تھی۔

غارِ حرا میں خلوت گزینی کی مدت ایک ماہ ہے یعنی آپ ﷺ نے پورے ماہ رمضان اس میں قیام فرمایا۔ وہاں حضرت جبریل علیہ السلام 2029 تشریف لائے اور فرمایا اِقْرَاْ۔ جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں پڑھنے والا نہیں ہوں۔ تو جبریل علیہ السلام نے آپ ﷺ کو آغوش میں لے کر دبایا۔ اس طرح تین مرتبہ ہوا۔ پھر انہوں نے پانچ آیات پڑھیں۔ یہ آیتیں لے کر آپ ﷺ گھر واپس آئے۔ آپ ﷺ پر گھبراہٹ طاری تھی۔ جب آپ ﷺ کو آفاقہ ہوا تو آپ ﷺ نے بی بی خدیجہؓ کو سارا واقعہ سنایا۔ وہ انہیں اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں۔ انہوں نے سنتے ہی کہا یہ وحی فرشتہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اُتارا تھا۔ کاش میں اس وقت زندہ ہوتا جب آپ ﷺ کی قوم آپ ﷺ کو وطن سے نکالے گی، کیونکہ جب بھی کوئی آدمی یہ دین حق لے کر آیا جو آپ ﷺ لائے ہیں تو اس کی قوم نے اس کو ستایا ہے۔ اس کے چند ہی روز بعد ورقہ بن نوفل کا انتقال ہو گیا۔ اس واقعہ کے بعد وحیٔ قرآن کا سلسلہ رُک گیا۔ روایات میں وحی میں وقفہ کی مدت ڈھائی سے تین سال تک بیان کی گئی ہے۔ (معارف القران۔ ج ۸، ص ۷۸۴ سے ماخوذ)۔

یہ قصہ خود اپنے منہ سے بول رہا ہے کہ فرشتے کی آمد سے ایک لمحہ پہلے تک بھی رسول اللہ ﷺ اس بات سے خالی الذہن تھے کہ آپ ﷺ نبی بنائے جانے والے ہیں۔ اس چیز کا طلب یا متوقع ہونا تو درکنار آپ ﷺ کے وہم وگمان میں بھی یہ نہ تھا کہ ایسا کوئی معاملہ پیش آنے والا ہے۔ فرشتے کا اس طرح سامنے آنا ایک حادثہ تھا جس کا پہلا تاثر آپ ﷺ کے اوپر وہی وہا جو ایک انسان پر فطری طور پر ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپ ﷺ اسلام کی دعوت لے کر اٹھے تو مکہ کے لوگوں نے آپ ﷺ پر ہر طرح کے اعتراضات کیے، مگر ان میں کوئی یہ کہنے والا نہ تھا کہ ہم کو تو پہلے ہی خطرہ تھا کہ آپ کوئی دعویٰ کرنے والے ہیں کیونکہ آپ ایک مدت سے نبی بننے کی تیاریاں کر رہے تھے، دوسری بات یہ ہے کہ ورقہ بن نوفل مکہ کے باشندے تھے، بچپن سے حضور ﷺ کی زندگی دیکھتے چلے آ رہے تھے اور پندرہ سال کی قریبی رشتہ داری کی بنا پر وہ آپ ﷺ کے حالات سے اور زیادہ گہری واقفیت رکھتے تھے۔ انہوں نے جب یہ واقعہ سنا تو اِسے کوئی وسوسہ نہیں سمجھا بلکہ سنتے ہی کہہ دیا کہ یہ وہی فرشتہ ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے نزدیک آپ ﷺ اتنے بلند پایہ انسان تھے کہ آپ ﷺ کا نبوت کے منصب پر سرفراز ہونا کوئی قابل تعجب بات نہ تھی۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ:2

آپ۔ ۵۔ کا مطلب یہ ہے کہ انسان اصل میں بالکل بے علم تھا۔ اسے جو کچھ بھی علم حاصل ہوا ہے وہ اللہ کے دینے سے حاصل ہوا ہے۔ اللہ ہی نے جس مرحلے پر انسان کے لیے علم کے جو دروازے کھولنے چاہے وہ اس پر کھلتے چلے گئے۔ جن جن چیزوں کو انسان اپنی علمی دریافت سمجھتا ہے درحقیقت وہ پہلے اس کے علم میں نہ تھیں، اللہ ہی نے جب چاہا ان کا علم اسے دیا (تفہیم القرآن)۔ یہ وہ مادی علوم ہیں، جن کا دروازہ کھولنے کا جب اللہ تعالیٰ فیصلہ کر لیتا ہے تو انسان اپنے حواس خمسہ کے ذریعے اور اپنی عقل کی مدد سے ان تک رسائی حاصل کر لیتا ہے۔ لیکن اس کائنات کے وہ حقائق جو انسان کے حواس خمسہ اور عقل کی پہنچ سے باہر ہیں، ان کی تعلیم کے لیے رسل وکتب کا سلسلہ قائم کیا تھا۔ پھر رسول اللہ ﷺ پر اس علم وحی کے فائنل ایڈیشن کا نزول ہوا۔ جبکہ مادی علوم کی تعلیم کا سلسلہ ابھی جاری ہے۔ (مرتب)

آیت نمبر (6تا19)

س ف ع

(ف) سَفْعًا کسی کو پکڑ کر گھسیٹنا۔ کھینچنا۔ زیر مطالعہ آیت۔15۔

ز ب ن

(ض) زَبْنًا ٹکر لگانا۔ دھکے دینا۔

زِبْنِيَةٌ ج زَبَانِيَةٌ۔ سخت انسان یا جن۔ سپاہی۔ زیر مطالعہ آیت۔18۔

ترکیب

(آیت۔8) اَلرُّجْعٰى فُعْلٰى کا وزن ہے لیکن یہ افعل تفضیل میں واحد مونث نہیں ہے بلکہ یہ رَجَعَ۔ يَرْجِعُ کا ایک مصدر ہے۔ فُعْلٰى کے وزن پر کچھ مصدر بھی آتے ہیں۔ (آیات۔11۔13) ان دونوں آیات میں اِنْ شرطیہ ہے۔ دونوں کا جوابِ شرط محذوف ہے جسے ترجمہ میں ظاہر کیا جائے گا۔ (آیت۔15) يَنْتَهِ دراصل مضارع يَنْتَهِيْ ہے۔ اس کو لَمْ نے مجزوم کیا تو یا گر گئی۔ لَنَسْفَعًا دراصل مضارع نَسْفَعُ ہے۔ اس پر لام تاکید اور نون خفیفہ داخل ہوا تو یہ لَنَسْفَعَنْ ہو گیا اور عربی میں یہ اسی طرح لکھا جاتا ہے۔ یہ قرآن کا مخصوص املا ہے کہ نون خفیفہ کی جگہ تنوین لگا کر الف کا اضافہ کر دیتے ہیں۔ ایسا قرآن میں صرف دو مرتبہ ہوا ہے۔ ایک اس جگہ اور دوسری سورۂ یوسف کی آیت۔32۔ میں لَيَكُوْنَنْ کو لَيَكُوْنًا لکھا گیا ہے۔ (آیت۔16) نَاصِيَةٍ سابقہ آیت میں بِالنَّاصِيَةِ کا بدل ہونے کی وجہ سے حالتِ جَر میں ہے اور یہ نکرہ موصوفہ ہے۔ حالانکہ بِالنَّاصِيَةِ معرفہ ہے اور اس کا بدل نَاصِيَةٍ نکرہ ہے۔ لیکن نکرہ موصوف ہو تو معرفہ سے بدل پڑ سکتا ہے۔ (تدبر قرآن) كَاذِبَةٍ اور خَاطِئَةٍ اس کی صفت ہونے کی وجہ سے حالتِ جَر میں ہیں۔

كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ	لَيَطْغٰٓى ۙ۶	اَنْ رَّاٰهُ	اسْتَغْنٰى ؕ۷	اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ
ہر گز نہیں! بیشک انسان	ضرور سرکشی کرتا ہے	(جب) کہ وہ دیکھے خود کو	بے نیاز	بے شک آپؐ کے رب کی طرف ہی

الرُّجْعٰى ؕ۸	اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يَنْهٰى ۙ۹	عَبْدًا اِذَا صَلّٰى ؕ۱۰	اَرَءَيْتَ
لوٹنا ہے (سب کو)	کیا آپؐ نے دیکھا اس کو جو روکتا ہے	ایک بندے کو جب وہ نماز پڑھتا ہے	کیا آپؐ نے غور کیا

اِنْ كَانَ	عَلَى الْهُدٰٓى ۙ۱۱	اَوْ اَمَرَ بِالتَّقْوٰى ؕ۱۲	اَرَءَيْتَ
اگر وہ ہوتا	ہدایت پر	یا وہ ترغیب دیتا خداخوفی کی (تو کیا انسان ہوتا)	کیا آپؐ نے غور کیا

اِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ؕ۱۳	اَلَمْ يَعْلَمْ	بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰى ؕ۱۴
اگر اس نے جھٹلایا اور اعراض کیا (تو اپنا ہی نقصان کیا)	کیا اس نے جانا ہی نہیں	کہ اللہ دیکھتا ہے (سب کچھ)

كَلَّا لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ ۙ۬	لَنَسْفَعًۢا بِالنَّاصِيَةِ ۙ۱۵	نَاصِيَةٍ
ہر گز نہیں! بیشک اگر وہ باز نہ آیا	تو ہم ضرور پکڑ کر گھسیٹیں گے (اس کو) پیشانی کے بال سے	ایک ایسی پیشانی سے جو

كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ۚ۱۶	فَلْيَدْعُ نَادِيَهٗ ۙ۱۷	سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ۙ۱۸
جھوٹی خطا کار ہے	پس اسے چاہیے کہ وہ بلا لے اپنے اہل مجلس کو	ہم بلائیں گے سپاہیوں (فرشتوں) کو

كَلَّا ؕ لَا تُطِعْهُ	وَاسْجُدْ	وَاقْتَرِبْ ۩
ہرگز نہیں! آپ مت مانیں اس کی	اور آپ سجدہ کریں	اور آپ قربت اختیار کریں (سجدہ۔ ۱۴)

نوٹ:1

ان آیات میں آخر سورہ تک ایک واقعہ کی طرف اشارہ ہے کہ جب نبی کریم ﷺ نے نماز پڑھنا شروع کی تو ابوجہل نے آپ ﷺ کو نماز پڑھنے سے روکا اور دھمکی دی کہ آئندہ نماز پڑھیں گے تو وہ معاذ اللہ آپ ﷺ کی گردن کو پاؤں سے کچل دے گا۔ (معارف القرآن)۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ مقام ابراہیم پر نماز پڑھ رہے تھے۔ ابوجہل کا ادھر سے گزر ہوا تو اس نے کہا کہ میں نے تم کو اس سے منع نہیں کیا تھا۔ اور اس نے آپ ﷺ کو دھمکیاں دیں۔ جواب میں آپ ﷺ نے اس کو جھڑک دیا۔ اس پر اس نے کہا کہ تم کس بل بوتے پر مجھے ڈراتے ہو۔ خدا کی قسم اس وادی میں میرے حمایتی سب سے زیادہ ہیں۔ آیات۔ 17۔18۔ میں اس کا حوالہ ہے۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ:2

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبوت کے منصب پر سرفراز فرمانے کے بعد رسول اللہ ﷺ کو نماز پڑھنے کا طریقہ سکھا دیا تھا۔ اس طریقے کا ذکر قرآن مجید میں کہیں نہیں ہے۔ یہ اس بات کا ایک اور ثبوت ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر صرف وہی وحی نازل نہیں ہوتی تھی جو قرآن میں درج ہے بلکہ اس کے علاوہ بھی وحی کے ذریعے سے آپ ﷺ کو ایسی باتوں کی تعلیم دی جاتی تھی جو قرآن میں درج نہیں ہے۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ:3

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بندہ اپنے رب سے قریب تر اُس وقت ہوتا ہے جب وہ سجدے میں ہو۔ اس لیے سجدہ میں بہت دعا کیا کرو ایک دوسری حدیث میں یہ لفظ بھی آئے ہیں کہ سجدے کی حالت میں دعا قبول ہونے کے لائق ہے۔

نفل نماز کے سجدہ میں دعا کرنا ثابت ہے۔ بعض احادیث میں یہ دعا کے خاص الفاظ بھی آئے ہیں۔ وہ الفاظ ماثورہ پڑھے جائیں تو بہتر ہے۔ فرض نمازوں میں اس طرح کی دعائیں ثابت نہیں ہیں کیونکہ فرائض میں اختصار مطلوب ہے (معارف القرآن)۔ ہمیں بزرگوں نے یہ سکھایا تھا کہ نفل نماز کے سجدوں میں صرف وہ دعائیں مانگی جاسکتی ہیں جو قرآن مجید اور احادیث میں دی ہوئی ہیں۔ ان کے علاوہ دعائیں مانگنی ہوں تو سلام پھیر کے استغفار اور درود شریف پڑھنے کے بعد مانگتے ہوئے سجدے میں چلے جاؤ، پھر جو چاہو مانگو، جس زبان میں چاہو مانگو۔ (مرتب)۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سورۃ القدر (97)

آیت نمبر (1 تا 5)

اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ	فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۝۱	وَمَاۤ اَدْرٰىكَ	مَا
یقیناً ہم نے ہی اتارا اس (قرآن) کو	قدر کی رات میں	اور آپ کیا جانیں	کیا ہے

لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۝۲	لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۙ خَيْرٌ	مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ ۝۳	تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ
قدر کی رات	قدر کی رات زیادہ بہتر ہے	ایک ہزار مہینوں سے	اترتے ہیں فرشتے اور وہ روح (جبریلؑ)

فِيۡهَا بِاِذۡنِ رَبِّهِمۡ ۚ	مِنۡ كُلِّ اَمۡرٍ ۛ ۙ	سَلٰمٌ ۛ هِىَ	حَتّٰى مَطۡلَعِ الۡفَجۡرِ ۞ 2029
اس (رات میں) میں اپنے رب کے اِذن سے	ہر کام سے (کے ساتھ)	سلامتی ہے یہ (رات)	فجر کے طلوع ہونے کے وقت تک

نوٹ: 1 قدر کے ایک معنی عظمت وشرف (قدر و قیمت والا ہونا) کے ہیں۔ اور اس رات کو لیلۃ القدر کہنے کی وجہ اس رات کی عظمت ہے۔ قدر کے دوسرے معنی تقدیر کے بھی آتے ہیں۔ اس معنی کے اعتبار سے اس کو لیلۃ القدر کہنے کی وجہ یہ ہوگی کہ اس رات میں تمام مخلوقات کے لیے جو کچھ تقدیر میں لکھا ہے، اس کا جو حصہ اس سال رمضان سے اگلے رمضان تک پیش آنے والا ہے، وہ ان فرشتوں کے حوالے کر دیا جاتا ہے جو کائنات کے امور نافذ کرنے کے لیے مامور ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے کہ وہ فرشتے جن کو یہ امور سپرد کیے جاتے ہیں چار ہیں، حضرت اسرافیلؑ، حضرت میکائیلؑ، حضرت جبریلؑ۔

قرآن کریم کی تصریحات سے ثابت ہے کہ شب قدر ماہِ رمضان المبارک میں آتی ہے۔ مگر تاریخ کے تعین میں علماء کے مختلف اقوال ہیں صحیح یہ ہے کہ لیلۃ القدر رمضان کے آخری عشرہ میں ہوتی ہے مگر آخری عشرہ کی کوئی خاص تاریخ متعین نہیں بلکہ ان میں سے کسی بھی رات میں ہوسکتی ہے اور وہ ہر رمضان میں بدلتی بھی رہتی ہے۔ اور ان میں سے طاق راتوں میں زیادہ احتمال ہے۔ اس رات کی سب سے بڑی فضیلت تو وہی ہے جو اس سورت میں بیان ہوئی ہے کہ اس ایک رات کی عبادت ایک ہزار مہینوں یعنی 83 سال سے زائد کی عبادت سے بھی بہتر ہے۔ پھر بہتر ہونے کی کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ کتنی بہتر ہے دوگنی، چوگنی، دس گنی، سوگنی وغیرہ سب ہی احتمالات ہیں۔ (قیاس یہ کہتا ہے کہ حد مقرر نہ کرنے میں شاید یہ حکمت ہو کہ بندے بندے کی عبادت میں اخلاص کی وجہ سے فرق ہوتا ہے۔ اس کا لحاظ رکھنے کی خاطر حد کو کھلا چھوڑا گیا ہے۔ گویا فکر ہر کس بقدر ہمت اوست والی بات ہے۔ مرتب) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شب قدر میں عبادت کے لیے کھڑا رہا اس کے تمام پچھلے گناہ معاف ہوگئے۔ ایک اور حدیث میں فرمایا کہ شب قدر میں وہ تمام فرشتے جن کا مقام سدرۃ المنتہیٰ پر ہے، حضرت جبریلؑ کے ساتھ دنیا میں اترتے ہیں اور کوئی مومن مرد یا عورت ایسی نہیں جس کو وہ سلام نہ کرتے ہوں بجز اس کے جو شراب پیتا ہو یا سور کا گوشت کھاتا ہو۔ شب قدر میں بعض حضرات کو خاص انوار کا مشاہدہ بھی ہوتا ہے، مگر اس رات کی برکات اور ثواب حاصل ہونے میں ایسے مشاہدات کا کچھ دخل نہیں ہے اس لیے اس کی فکر میں نہیں پڑنا چاہیے۔

اس سورت کی پہلی آیت میں تصریح ہے کہ قرآن کریم شب قدر میں نازل ہوا۔ اس کا یہ مفہوم بھی ہوسکتا ہے کہ پورا قرآن لوحِ محفوظ سے آسمان دنیا پر اتارا گیا پھر جبریلؑ اس کو تدریجاً۔ ۲۳۔ سال کے عرصے میں اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق تھوڑا تھوڑا لاتے رہے۔ اور یہ بھی مراد ہوسکتی ہے کہ نزولِ قرآن کی ابتدا اس رات میں چند آیتوں سے ہوگئی، باقی بعد میں نازل ہوتا رہا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مصحفِ ابراہیم علیہ السلام تیسری رمضان میں تورات چھٹی رمضان میں، انجیل تیرھویں رمضان اور زبور اٹھارویں رمضان میں نازل ہوئی ہیں۔

هِىَ حَتّٰى مَطۡلَعِ الۡفَجۡرِ ۞ کا مطلب یہ ہے کہ لیلۃ القدر کی برکات رات کے کسی خاص حصے کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں۔ غروب آفتاب سے طلوع فجر تک ایک ہی حکم ہے۔ جس شخص نے شب قدر میں عشاء اور فجر کی نماز جماعت سے پڑھ لی اس نے بھی اس رات کا ثواب پا لیا اور جو شخص جتنا زیادہ کرے گا اتنا زیادہ ثواب پائے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص نے عشاء کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کر لی تو آدھی رات کے قیام کا ثواب پا لیا اور جس نے صبح کی نماز بھی جماعت سے ادا کر لی تو پوری رات جاگنے

2029

عبادت کرنے کا ثواب حاصل کرلیا۔

اختلاف مطالعہ (سورج طلوع ہونے کے وقت میں فرق) کی وجہ سے مختلف ملکوں اور شہروں میں شب قدر مختلف اوقات اور مختلف دنوں میں ہوتو اس میں کوئی اشکال نہیں ہے۔ کیونکہ ہر جگہ کے اعتبار سے جو رات شب قدر قرار پائے گی، اُس جگہ اُسی رات میں شب قدر کے برکات حاصل ہوں گے۔ (معارف القرآن۔ ج۸۔ ص۷۹۱ تا ۷۹۴ سے ماخوذ)۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ البینہ (98)

آیت نمبر (1 تا 5)

ترکیب

(آیت۔1) لَمۡ یَکُنِ میں کَانَ کا اسم اَلَّذِیۡنَ سے اَلۡمُشۡرِکِیۡنَ تک کا پورا فقرہ ہے اور مُنۡفَکِّیۡنَ اس کی خبر ہونے کی وجہ سے حالتِ نصب میں ہے۔ اَلۡمُشۡرِکِیۡنَ سابقہ مِنۡ پر عطف ہونے کی وجہ سے حالتِ جر میں ہے۔ (آیت۔2) رَسُوۡلٌ کو اگر خبر مانیں تو اس سے پہلے اس کا مبتدا محذوف مانا جائے گا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اس کو فاعل مانیں اور اس سے پہلے فعل فَقَدۡ جَاءَ یا فَقَدۡ اَتٰی محذوف مانیں۔ دونوں صورتوں میں یہ پورا جملہ سابقہ اَلۡبَیِّنَۃُ کی وضاحت ہے۔ ترجمہ میں ہم دوسری صورت کو ترجیح دیں گے کیونکہ ایسی صورت میں آگے فعل مضارع یَتۡلُوۡا کو رَسُوۡلٌ کا حال ماننے کی گنجائش پیدا ہوتی ہے، جو زیادہ حسب حال ہے۔ صُحُفًا مُّطَہَّرَۃً یہ پورا مرکب توصیفی نکرہ مخصوصہ ہے۔ اور آگے کا پورا جملہ اس کی خصوصیت ہے۔ (آیت۔3) کُتُبٌ قَیِّمَۃٌ مبتدا مؤخر نکرہ ہے اس کی خبر موجودۃٌ محذوف ہے اور فِیۡہَا قائم مقام خبر مقدم ہے۔ اس میں ھَا کی ضمیر صُحُفًا مُّطَہَّرَۃً کے لیے ہے۔ (آیت۔5) لِیَعۡبُدُوۡا پر لام کی نہیں بلکہ لام امر ہے اور یَعۡبُدُوۡا منصوب نہیں بلکہ مجزوم ہے۔ ترجمہ اسی لحاظ سے کرنا ہوگا۔ مُخۡلِصِیۡنَ حال ہونے کی وجہ سے حالتِ نصب میں ہے اور یہ اسم الفاعل ہے۔ اس نے الدِّیۡنَ کو نصب دی ہے۔ یُقِیۡمُوۡا اور یُؤۡتُوۡا سابقہ لِیَعۡبُدُوۡا کے لام امر پر عطف ہونے کی وجہ سے مجزوم ہیں۔ دِیۡنُ الۡقَیِّمَۃِ مرکب اضافی ہے۔ اَلۡقَیِّمَۃِ مضاف الیہ ہونے کی وجہ سے دِیۡنُ کی صفت نہیں ہوسکتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس کا موصوف یہاں محذوف ہے جو اَلۡمِلَّۃِ یا اَلدِّیۡنِ ہوسکتا ہے۔

ترجمہ

لَمۡ یَکُنِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا	مِنۡ اَہۡلِ الۡکِتٰبِ وَالۡمُشۡرِکِیۡنَ	مُنۡفَکِّیۡنَ
تھے ہی نہیں وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا	مشرکین اور اہل کتاب میں سے	باز آنے والے (کفر سے)

حَتّٰی تَاۡتِیَہُمُ	الۡبَیِّنَۃُ ۙ﴿۱﴾	رَسُوۡلٌ مِّنَ اللّٰہِ	یَّتۡلُوۡا صُحُفًا مُّطَہَّرَۃً ۙ﴿۲﴾
جب تک کہ (نہ) پہنچے ان کے پاس	روشن دلیل	(تو آچکا ہے) ایک رسول اللہ کی طرف سے	پڑھتا ہوا ایسے پاکیزہ صحیفے

فِیۡہَا کُتُبٌ قَیِّمَۃٌ ؕ﴿۳﴾	وَمَا تَفَرَّقَ	الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ	اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ مَا
جن میں پختہ لکھی ہوئی باتیں (احکام) ہیں	اور الگ الگ نہیں ہوئے	وہ لوگ جن کو دی گئی کتاب	مگر اس کے بعد سے جو

جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ ۝	وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا	لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ	مُخْلِصِيْنَ
آئی ان کے پاس واضح بات	اوران لوگوں کو حکم نہیں دیا گیا سوائے اس کے کہ	چاہیے کہ وہ لوگ بندگی کریں اللہ کی	خالص کرنے والے ہوتے ہوئے

لَهُ الدِّيْنَ ۙ	حُنَفَآءَ	وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ
اسی کے لیے ضابطۂ حیات (دین) کو	یکسو ہوتے ہوئے	اور چاہیے کہ وہ لوگ قائم کریں نماز کو

وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ	وَذٰلِكَ	دِيْنُ الْقَيِّمَةِ ۝
اور چاہیے کہ وہ لوگ پہنچائیں زکوۃ کو	اور یہ ہے	(لوگوں کا) پختہ ضابطۂ حیات (دین)

نوٹ:1

قرآن مجید کی ترتیب میں سورۃ البینہ کو سورہ علق اور سورۂ قدر کے بعد رکھنا بہت معنی خیز ہے۔ سورۂ علق میں پہلی وحی درج کی گئی ہے۔ سورۂ قدر میں بتایا گیا ہے کہ وہ کب نازل ہوئی اور اس سورہ میں بتایا گیا ہے کہ اس کتاب کے ساتھ ایک رسول بھیجنا کیوں ضروری تھا۔

نوٹ:2

کفر میں مشترک ہونے کے باوجود اہل کتاب مشرکین، دونوں گروہوں کو دو الگ الگ ناموں سے یاد کیا گیا ہے۔ اہل کتاب سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے پاس انبیاء کی لائی ہوئی کتابیں تھیں اور مشرکین سے مراد وہ لوگ ہیں جو کسی نبی کے پیرو اور کسی کتاب کے ماننے والے نہ تھے۔ اگرچہ قرآن مجید میں اہل کتاب کے شرک کا بہت سے مقامات پر ذکر کیا گیا ہے لیکن قرآن میں کہیں بھی ان کے لیے مشرک کی اصطلاح استعمال نہیں کی گئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اصل دین تو توحید ہی کو مانتے تھے اور پھر شرک کرتے تھے۔ بخلاف اس کے غیر اہل کتاب کے لیے مشرک کا لفظ بطور اصطلاح استعمال کیا گیا ہے کیونکہ وہ اصل دین شرک ہی کو قرار دیتے تھے اور توحید کو ماننے سے ان کو قطعی انکار تھا۔ یہ فرق ان دونوں گروہوں کے درمیان صرف اصطلاح میں ہی نہیں بلکہ شریعت کے احکام میں بھی ہے۔ اہل کتاب کا ذبیحہ مسلمانوں کے لیے حلال کیا گیا اور ان کی عورتوں سے نکاح کی اجازت دی گئی۔ جبکہ مشرکین کا نہ ذبیحہ حلال ہے اور نہ ان کی عورتوں سے نکاح حلال ہے۔

نوٹ:3

آیت۔1۔ کا مطلب ہے کہ ان لوگوں کے کفر سے نکلنے کی کوئی صورت اس کے سوا نہ تھی کہ ایک روشن دلیل آ کر انہیں کفر کی ہر صورت کا غلط اور خلافِ عقل ہونا سمجھائے اور راہ راست کو واضح اور مدلل طریقے سے ان کے سامنے پیش کر دے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس روشن دلیل کے آجانے کے بعد وہ سب کفر سے باز آجانے والے تھے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دلیل کی غیر موجودگی میں ان کا حالتِ کفر سے نکلنا ممکن ہی نہ تھا۔ البتہ اس کے آنے کے بعد بھی ان میں سے کچھ لوگ اگر کفر پر قائم رہیں تو اس کی ذمہ داری پھر ان ہی پر ہے۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ:4

کفر و شرک کی عالمگیر ظلمت کو دور کرنے کے لیے رب العالمین کی حکمت و رحمت کا تقاضہ یہ ہوا کہ جیسے یہ مرض شدید اور عالمگیر ہے، اس کے علاج کے لیے ویسا ہی کوئی ماہر معالج بھیجنا چاہیے آگے اس ماہر حکیم کی صفت بیان کی کہ اس کا وجود ایک اَلْبَيِّنَة یعنی روشن دلیل ہو۔ آگے فرمایا اس معالج سے مراد اللہ کا وہ رسول ہے جو قرآن کی واضح حجت لے کر ان کے پاس آئے۔ آگے قرآن کی چند اہم صفات کا بیان ہے۔

تلاوت کے معنی پڑھنے کے ہیں لیکن ہر پڑھنے کو تلاوت نہیں کہا جاتا بلکہ تلاوت اس پڑھنے کو کہتے ہیں جو پڑھانے والے کی تلقین کے بالکل مطابق ہو۔ کتاب اور صحیفہ تقریباً ہم معنی لفظ ہیں۔ لیکن کتاب کا لفظ حکم کے معنی میں بھی بولا جاتا ہے اور قرآن میں بھی اس معنی میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً الانفال۔68۔ اس جگہ بھی یہی دوسرے معنی مراد ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے کہ صُحُفًا مُّطَهَّرَةً سے مراد یہ ہے کہ یہ صحیفے جھوٹ، شک، نفاق اور گمراہی سے پاک ہیں۔ آگے قَيِّمَةٌ کو اگر مستقیم کے معنی میں کتب یعنی احکام کی صفت لیں تو مطلب یہ ہوگا کہ یہ احکام منصفانہ اور معتدل ہیں اور اگر اس کو مضبوط و مستحکم کے معنی میں لیں تو مطلب ہوگا کہ یہ احکام جو قرآن میں آئے ہیں قیامت تک قائم رہیں گے۔ (معارف القرآن)۔

نوٹ:5

آیت۔4۔ میں تفرق سے مراد وہ انکار و اختلاف ہے جو قرآن اور نبی کریم ﷺ کی نبوت کے بارے میں اہل کتاب میں پیدا ہوا۔ اُن کی آسمانی کتب تورات و انجیل میں رسول اللہ ﷺ کی نبوت کا، آپ ﷺ کی خاص خاص صفات کا اور آپ ﷺ پر قرآن نازل ہونے کا واضح ذکر موجود تھا۔ اس لیے کسی یہودی یا نصرانی کو اس میں اختلاف نہیں تھا کہ آخر زمانے میں رسول اللہ ﷺ تشریف لائیں گے، آپ ﷺ پر قرآن (اللہ کا کلام) نازل ہوگا اور آپ ﷺ ہی کا اتباع سب پر لازم ہوگا۔ مگر جب اللہ کا اَلْبَيِّنَه یعنی رسول آخر الزماں تشریف لے آئے تو ان میں افتراق پیدا ہو گیا کہ کچھ لوگ تو آپ ﷺ پر ایمان لے آئے اور بہت سے انکار کرنے لگے۔ یہ معاملہ چونکہ اہل کتاب ہی کے ساتھ مخصوص تھا اس لیے اس آیت میں صرف اہل کتاب ہی کا ذکر فرمایا ہے، مشرکین کو شامل نہیں کیا۔
(معارف القرآن)۔

آیت نمبر (6تا8)

ترکیب

اَلْمُشْرِكِيْنَ کے دو امکانات ہیں۔ ایک یہ کہ اس کو مِنْ پر عطف مانا جائے۔ ایسی صورت میں مطلب ہوگا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَ (مِنَ) الْمُشْرِكِيْنَ۔ دوسرے یہ کہ اس کو اِنَّ پر عطف مانا جائے۔ ایسی صورت میں مطلب ہوگا۔ وَ(اِنَّ) الْمُشْرِكِيْنَ دونوں ترجمے درست مانے جائیں گے۔ یہ پورا فقرہ مبتدا ہے۔ اس کی خبر محذوف ہے۔ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ قائم مقام خبر ہے اور خٰلِدِيْنَ تفضیل کل (Superlative Degree) ہے۔ (دیکھیں آسان عربی گرامر حصہ سوم، پیراگراف:٦٢:٦) اَلْبَرِيَّةِ دراصل فَعِيْلٌ کے وزن پر بَرِيْءٌ کا مونث بَرِيْئَةٌ ہے، اس کو اس طرح بھی پڑھتے ہیں اور ہمزہ کو یا میں تبدیل کر کے بَرِيَّةٌ بھی پڑھتے ہیں۔ (آیت۔8) جزاؤُهُمْ مبتدا ہے۔ عِنْدَ رَبِّهِمْ اس کی خبر نہیں ہے بلکہ متعلق خبر مقدم ہے اور جَنّٰتُ عَدْنٍ اس کی خبر ہے۔

ترجمہ

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا	مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ	وَالْمُشْرِكِيْنَ
بیشک وہ لوگ جنہوں نے انکار کیا	اہل کتاب میں سے	اور (بیشک) سب شرک کرنے والے

فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ	خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ	اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ ۝٦
جہنم کی آگ میں ہیں	ہمیشہ رہنے والے ہوتے ہوئے اس میں	وہ لوگ ہی تمام مخلوق کے بدترین ہیں

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ	اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ۝٧
بیشک وہ لوگ جو ایمان لائے	اور اُنہوں نے عمل کیے نیکیوں کے	وہ لوگ ہی تمام مخلوق کے بہترین ہیں

جَزَآؤُهُمْ	عِنْدَ رَبِّهِمْ	جَنّٰتُ عَدْنٍ	تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ
ان لوگوں کی جزا	ان کے رب کے پاس	عدن کے باغات ہیں	بہتی ہیں جن کے دامن سے نہریں

خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا ؕ	رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ
ایک حالت میں رہنے والے ہوتے ہوئے اس میں ہمیشہ	راضی ہوا اللہ ان لوگوں سے

وَرَضُوْا عَنْهُ ؕ	ذٰلِكَ لِمَنْ	خَشِیَ رَبَّهٗ ۚ﴿۸﴾
اور وہ لوگ راضی ہوئے اس سے	یہ اس کے لیے ہے جو	مرعوب ہوا اپنے رب سے

نوٹ:1

آیت۔6۔ میں فرمایا کہ جو قرآن کی تکذیب کر کے کفر کے مرتکب ہوئے ہیں وہ سب جہنم میں بھر دیئے جائیں گے۔ ساتھ ہی یہ تاکید بھی ہے کہ وہ اس جہنم میں ہمیشہ رہنے کے لیے داخل کیے جائیں گے۔ یہاں اہل کتاب کے زعم پر نظر رہے کہ اول تو دوزخ کی آگ سے ان کو کوئی سابقہ پڑنے والا نہیں ہے اور اگر پڑا بھی تو وہ چند دنوں سے زیادہ کے لیے نہیں ہوگا۔ آگے اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِیَّةِ ؕ﴿۶﴾ فرما کر ان کے غرور و تکبر پر ضرب لگائی گئی ہے۔ اہل کتاب اور مشرکین کے سردار قرآن اور پیغمبر ﷺ پر ایمان لانے کے لیے شرط لگاتے تھے کہ جب تک کوئی فرشتہ آسمان سے نہیں اترے گا یا ایسی ہی دوسری شرائط لاتے کہ اس کے بغیر وہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ محمد (ﷺ) اپنے دعوائے رسالت میں سچے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ شرائط وہ اس غرور کی بنا پر لگاتے تھے کہ وہ اپنے ہی اندر کے ایک شخص کو جو دنیوی اعتبار سے ان سے کم تر بھی ہے، خدا کا رسول مان کر اس کی اطاعت کا قلادہ اپنی گردن میں کس طرح ڈال لیں۔ ان کا یہ غرور قبولِ حق سے مانع بنا جس نے ان کو بدترین مخلوق بنا دیا۔

نوٹ:2

آیت۔8۔ میں اہل جنت کی سب سے بڑی نعمت کا ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہے، اب ناراضی کا کوئی خطرہ نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اہل جنت سے خطاب فرمائیں گے یَا اَهْلَ الْجَنَّةِ تو اہل جنت جواب دیں گے لَبَّیْكَ رَبَّنَا وَسَعْدَیْكَ وَالْخَیْرُ كُلُّهٗ فِیْ یَدَیْكَ پھر حق تعالیٰ فرمائیں گے هَلْ رَضِیْتُمْ۔ وہ جواب دیں گے اے ہمارے پروردگار اب بھی راضی نہ ہونے کا کیا احتمال ہے جبکہ آپ نے ہمیں وہ سب کچھ عطا فرما دیا جو کسی مخلوق کو نہیں ملا۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کیا میں تم کو اس سے بھی افضل اور بہتر نعمت دے دوں۔ پھر فرمائیں گے کہ میں نے اپنی رضا تمہارے اوپر نازل کر دی اب کبھی تم سے ناراض نہ ہوں گا۔ اس حدیث میں اہل جنت سے پوچھا گیا ہے کہ آپ راضی بھی ہو۔ اور اس آیت میں خبر دی گئی ہے کہ اہل جنت اللہ تعالیٰ سے راضی ہوں گے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کے ہر حکم اور ہر فعل سے راضی ہونا تو لازمۂ عبدیت ہے۔ اس کے بغیر تو کوئی جنت میں جا ہی نہیں سکتا، پھر یہاں اہل جنت کی رضامندی کا ذکر کرنے کا کیا مطلب ہے جواب یہ ہے کہ رضا کے عام مفہوم کے اعتبار سے رضاء بالقدر فرائض عبدیت میں سے ہے لیکن رضا کا ایک درجہ اور بھی ہے جو اس سے آگے ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی بندے کو اس کی ہر مراد عطا کر دیں اور کوئی تمنا یا آرزو باقی نہ چھوڑیں۔ (معاف القرآن)۔

نوٹ:3

سورت کے آخر میں وہ بات بتا دی جس پر تمام دینی کمالات اور آخرت کی نعمتوں کا مدار ہے اور وہ ہے اللہ کی خشیت۔ خشیت اس خوف کو نہیں کہا جاتا جو کسی دشمن، درندے یا موذی چیز سے طبعاً ہوتا ہے بلکہ خشیت اس خوف کو کہتے ہیں جو کسی کی عظمت اور

جلال سے پیدا ہوا اور جس کا تقاضہ یہ ہو کہ وہ ہر حال میں اس کی رضا جوئی کی فکر کرے اور ناراضی کے شبہہ سے بھی بچتا رہے۔ یہی وہ چیز ہے جو انسان کو عبد کامل اور مقبول بنانے والی ہے۔ (معارف القرآن)۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ الزلزال (99)

آیت نمبر (1 تا 8)

ترکیب

(آیت۔1 تا 3) بات اِذَا سے شروع ہو رہی ہے اس لیے ان آیات میں آنے والے افعال ماضی کا ترجمہ مستقبل میں ہوگا۔ (آیت۔4) تُحَدِّثُ کا مفعول اَخۡبَارَهَا بنفسہٖ آیا ہے۔ اس حوالے سے نوٹ کر لیں کہ حَدَّثَ کا مفعول بِ کے صلہ کے ساتھ بھی آتا ہے اور بنفسہٖ بھی آتا ہے۔ (آیت۔5) قرآن مجید میں تقریباً ہر جگہ اَوۡحٰی کا مفعول الی کے صلہ کے ساتھ آیا ہے۔ یہ واحد مقام ہے جہاں اس کی ضمیر مفعولی ھا کے ساتھ لام کا صلہ آیا ہے۔ (آیت۔6) اَشۡتَاتًا حال ہونے کی وجہ سے حالتِ نصب میں ہے۔ یَرَوۡا مضارع مجہول ہے جو ثلاثی مجرد اور باب افعال میں ہم شکل ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہاں ان میں پہچان کا ایک قرینہ موجود ہے۔ رَءٰی۔ یَرٰی (ثلاثی مجرد) کا ایک مفعول آتا ہے، کسی کو دیکھا۔ جبکہ اَرٰی۔ یُرِیۡ (باب افعال) کے دو مفعول آتے ہیں، کس کو دکھایا اور کیا دکھایا۔ یہاں یُرَوۡا میں شامل ھم کی ضمیر نائب فاعل (یعنی مفعول اوّل) موجود ہے۔ آگے اَعۡمَالَهُمۡ اس کا مفعول ثانی آیا ہے۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ یہاں یُرَوۡا بابِ افعال کا مضارع مجہول ہے۔ (آیت۔7) مَنۡ شرطیہ ہے۔ اس لیے یَعۡمَلۡ مجزوم آیا ہے۔ یَرٰی جواب شرط ہونے کی وجہ سے مجزوم ہوا تو اس کی یا گر گئی۔ ترجمہ جملہ شرطیہ کے لحاظ سے ہوگا۔ یَعۡمَلۡ کا مفعول خَیۡرًا ہے جو نکرہ مخصوصہ ہے۔ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ اس کی خصوصیت مقدم ہے۔

ترجمہ

اِذَا زُلۡزِلَتِ الۡاَرۡضُ	زِلۡزَالَهَا ۙ﴿۱﴾	وَاَخۡرَجَتِ الۡاَرۡضُ	اَثۡقَالَهَا ۙ﴿۲﴾
جب ہلایا جائے گا زمین کو	جیسے اس کو ہلا مارنے کا حق ہے	اور نکال ڈالے گی زمین	اپنے سارے بوجھ

وَقَالَ الۡاِنۡسَانُ	مَا لَهَا ۚ﴿۳﴾	یَوۡمَئِذٍ تُحَدِّثُ	اَخۡبَارَهَا ۙ﴿۴﴾	بِاَنَّ رَبَّكَ
اور کہے گا انسان	اس کو کیا (ہو گیا) ہے	اُس دن وہ بیان کرے گی	اپنی خبریں	(یہ) اس سبب سے کہ آپؐ کے رب نے

اَوۡحٰی لَهَا ؕ﴿۵﴾	یَوۡمَئِذٍ یَّصۡدُرُ النَّاسُ	اَشۡتَاتًا ۙ	لِّیُرَوۡا	اَعۡمَالَهُمۡ ؕ﴿۶﴾
الہام کیا اس کو	اس دن واپس ہوں گے لوگ	الگ الگ ہوتے ہوئے	تا کہ ان لوگوں کو دکھایا جائے	ان کا سب کیا دھرا

فَمَنۡ یَّعۡمَلۡ	مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ خَیۡرًا	یَّرَهٗ ؕ﴿۷﴾	وَمَنۡ یَّعۡمَلۡ
پس جس نے (بھی) عمل کیا	کسی ذرہ کے ہم وزن کسی بھلائی کا	تو وہ دیکھ لے گا اس کو	اور جس نے (بھی) عمل کیا

مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا	یَّرَهٗ ﴿۸﴾
کسی ذرہ کے ہم وزن کسی برائی کا	تو وہ دیکھ لے گا اس کو

نوٹ:1 اس میں اختلاف ہے کہ یہاں جس زلزلہ کا ذکر ہے، یہ وہ زلزلہ ہے جو نفخہ اولیٰ (پہلا صور پھونکے جانے) سے پہلے دنیا

میں ہوگا، جیسا کہ علاماتِ قیامت میں ذکر آیا ہے۔ یا اس زلزلہ سے مراد وہ زلزلہ ہے جو دوسرا صور پھونکے جانے کے بعد ہوگا جب مُردے زندہ ہوکر اٹھیں گے۔ مفسرین کے اقوال مختلف ہیں لیکن آگے احوال قیامت اور حساب کتاب کا ذکر ہے، وہ قرینہ اسی کا ہے کہ یہ زلزلہ دوسرا صور پھونکے جانے کے بعد کا ہے۔ (معارف القرآن)۔

اس وقت زمین جو کچھ اس کے پیٹ میں ہے مثلاً مُردے یا سونا چاندی وغیرہ، سب کچھ باہر اگل ڈالے گی لیکن اس وقت مال کا کوئی لینے والا نہ ہوگا۔ (ترجمہ شیخ الہندؒ)۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ زمین اپنے جگر کے ٹکڑے بڑی چٹانوں کی صورت میں اُگل دے گی۔ اس وقت ایک شخص جس نے مال کے لیے کسی کو قتل کیا تھا وہ دیکھ کر کہے گا۔ یہ وہ چیز ہے جس کے لیے میں نے اتنا بڑا جرم کیا تھا۔ جس شخص نے اپنے رشتہ داروں سے مال کی وجہ سے قطع تعلق کیا تھا وہ کہے گا یہ ہے وہ چیز جس کے لیے میں نے یہ حرکت کی تھی چوری کی سزا میں جس چور کا ہاتھ کاٹا گیا تھا وہ کہے گا اس کے لیے میں نے اپنا ہاتھ گنوایا تھا۔ پھر کوئی بھی اس سونے کی طرف التفات نہ کرے گا۔ (معارف القرآن)۔

نوٹ:2

آیت۔4۔ کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ وہ حالات یہ ہیں کہ زمین ہر بندے اور بندی کے بارے میں اس عمل کی گواہی دے گی جو اس کی پیٹھ پر اس نے کیا ہوگا۔ وہ کہے گی کہ اس نے فلاں دن فلاں کام کیا تھا۔ یہ ہیں وہ حالات جو زمین بیان کرے گی۔

زمین کے متعلق یہ بات کہ وہ قیامت کے روز اپنے اوپر گزرے ہوئے سب حالات و واقعات بیان کرے گی، قدیم زمانے کے آدمی کے لیے بڑی حیران کُن ہوگی کہ آخر زمین کیسے بولنے لگے گی، لیکن آج علوم طبعی کے انکشافات اور سنیما، ریڈیو، ٹیلیویژن، ٹیپ ریکارڈر، الیکٹرانکس وغیرہ ایجادات کے اس دور میں یہ سمجھنا کچھ بھی مشکل نہیں کہ زمین اپنے حالات کیسے بیان کرے گی۔ انسان اپنی زبان سے جو کچھ بولتا ہے اس کے نقوش ہوا میں، ریڈیائی لہروں میں اور مختلف جگہوں کے ذرات میں ثبت ہیں۔ اللہ تعالیٰ جس وقت چاہے ان ساری آوازوں کو ٹھیک اسی طرح ان چیزوں سے دہروا سکتا ہے جس طرح کبھی وہ انسان کے منہ سے نکلی تھیں۔ پھر انسان نے زمین پر جہاں بھی کوئی کام کیا ہے اس کی ایک ایک حرکت کا عکس اس کے گرد و پیش کی تمام چیزوں پر پڑا ہے اور اس کی تصویر ان پر نقش ہو چکی ہے۔ بالکل گھپ اندھیرے میں بھی اس نے کوئی فعل کیا ہو تو خدا کی خدائی میں ایسی شعاعیں موجود ہیں جن کے لیے اندھیرا اور اُجالا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ وہ ہر حالت میں اس کی تصویر لے سکتی ہیں۔ یہ ساری تصویریں قیامت کے روز ایک متحرک فلم کی طرح انسان کے سامنے آجائیں گی۔

اگرچہ اللہ تعالیٰ ہر انسان کے اعمال کو براہِ راست خود جانتا ہے، مگر آخرت میں جب وہ عدالت قائم کرے گا تو جس کو بھی سزا دے گا، انصاف کے تمام تقاضے پورے کر کے دے گا۔ اس کی عدالت میں ہر مجرم انسان کے خلاف جو مقدمہ قائم کیا جائے گا، اس کو ایسی مکمل شہادتوں سے ثابت کر دیا جائے گا کہ اس کے مجرم ہونے میں کسی کلام کی گنجائش باقی نہ رہے۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ:3

آیت۔7۔ میں خیر سے مراد وہ خیر ہے جو شرعاً معتبر ہے یعنی جو ایمان کے ساتھ ہو۔ بغیر ایمان کے کوئی نیک عمل اللہ کے نزدیک نیک نہیں یعنی آخرت میں ایسے نیک عمل کا جو حالت کفر میں کیا گیا تھا، کوئی اعتبار نہیں ہوگا، گو دنیا میں اس کو اس کا بدلہ دے دیا جائے۔ اسی لیے اس آیت سے اس پر استدلال کیا گیا ہے کہ جس شخص کے دل میں ذرہ برابر ایمان ہوگا وہ بالآخر جہنم سے نکال لیا جائے گا۔ کیونکہ اس آیت کے وعدے کے مطابق اس کو اپنی نیکی کا پھل بھی آخرت میں ملنا ضروری ہے۔ اگر اور کوئی نیکی نہ ہو تو خود ایمان بہت بڑی نیکی ہے۔ اگلی آیت میں شر سے مراد وہ شر ہے جس سے اپنی زندگی میں توبہ نہ کر لی ہو، کیونکہ توبہ سے گناہوں کا معاف ہونا قرآن وسنت میں یقینی طور پر ثابت ہے۔ البتہ جس گناہ سے توبہ نہ کی گئی ہو وہ چھوٹا ہو یا بڑا، آخرت میں اس کا نتیجہ ضرور سامنے آئے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایسے گناہوں سے بچنے کا پورا اہتمام کرو جن کو چھوٹا یا حقیر سمجھا جاتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر بھی مواخذہ ہونا ہے۔ (معارف القرآن)۔

2029

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ العٰدیٰت (100)

آیت نمبر (1 تا 11)

ض ب ح

(ف) ضَبۡحًا دوڑتے ہوئے سینے سے آواز نکالنا۔ ہانپنا۔ زیر مطالعہ آیت۔1۔

ق د ح

(ف) قَدۡحًا دو چیزوں کو رگڑ کر آگ نکالنا، زیر مطالعہ آیت۔2۔

ن ق ع

(ف) نَقۡعًا کسی جگہ پانی کا جمع ہو کر ٹھہر جانا۔ گرد و غبار کا گر کر بیٹھ جانا۔

نَقۡعٌ اسم ذات بھی ہے۔ گرد و غبار۔ ٹھہرا ہوا پانی۔ زیر مطالعہ آیت۔4۔

ك ن د

(ن) كُنُوۡدًا زمین کا بنجر ہونا۔ انسان کا ناشکری کرنا۔

كَنُوۡدٌ فَعُوۡلٌ کے وزن پر مبالغہ ہے۔ نعمتوں کو بھولنے والا اور مصائب کو شمار کرنے والا۔ انتہائی ناشکرا۔ زیر مطالعہ آیت۔6۔

ح ص ل

(ن) حُصُوۡلًا حاصل ہونا۔ باقی رہنا۔

(تفعیل) تحصیلًا حاصل کرنا، ظاہر کرنا، کان سے سونا، چاندی یا دوسری معدنیات نکالنا۔ کسی چیز کا چھلکا اتار کر گودہ نکالنا۔ (زیر مطالعہ آیت۔10)

ترکیب

عربی میں عام طور پر گھوڑوں کے لیے جمع مؤنث کے صیغے استعمال کیے جاتے ہیں۔ ان آیات میں جمع مؤنث کے صیغوں کا ترجمہ اردو محاورے کے مطابق جمع مذکر میں کیا جائے گا، (آیت۔1) ضَبۡحًا حال ہونے کی وجہ سے حالت نصب میں ہے۔ (آیت۔2) قَدۡحًا مصدر ہے اور اس میں رگڑ کر آگ جلانے کا مفہوم ہے۔ جبکہ اَلۡمُوۡرِیٰتِ مادہ وری سے باب افعال میں اسم الفاعل ہے۔ اس میں بھی رگڑ کر آگ جلانے والے کا مفہوم ہے۔ یہ دونوں ہم معنی ہونے کی وجہ سے بہتر ہے کہ قَدۡحًا کو مُوۡرِیَات کا مفعول مطلق مانا جائے۔ (حافظ احمد یار صاحب)۔ اَلۡمُوۡرِیٰتِ کو حالتِ نصب میں ماننے کی کوئی وجہ یا قرینہ یہاں موجود نہیں ہے۔ اس لیے اس کو پہلی آیت کے

واوقسمیہ پرعطف مان کرحالتِ جرّ میں مانا جائے گا۔ضَبْحًا ظرف ہونے کی وجہ سے حالتِ نصب میں ہے۔(2029 آیت۔4۔5)۔ اَثَرْنَ اور وَسَطْنَ فعل ماضی میں جمع مؤنث کے صیغے ہیں۔لیکن ان میں آفاقی صداقت یعنی گھوڑوں کی مستقل خصلت کا بیان ہے اس لیے ان کا ترجمہ حال میں ہوگا۔(دیکھیں آیت۔2/البقرہ:49،نوٹ۔2)۔نَقْعًا اور جَمْعًا بالترتیب اَثَرْنَ اور وَسَطْنَ کے مفعول ہونے کی وجہ سے حالتِ نصب میں ہیں۔

ترجمہ

وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا ۙ﴿۱﴾	فَالْمُوْرِيٰتِ	قَدْحًا ۙ﴿۲﴾
قسم ہے ہانپتے ہوئے تیز دوڑنے والوں (گھوڑوں) کی	پھر قسم ہے رگڑ سے آگ نکالنے والوں کی	جیسا رگڑنے کا حق ہے

فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا ۙ﴿۳﴾	فَاَثَرْنَ بِهٖ	نَقْعًا ۙ﴿۴﴾	فَوَسَطْنَ بِهٖ
پھر قسم ہے صبح کے وقت غارتگری کرنے والوں کی	پھر وہ اٹھاتے ہیں اُس (وقت) میں	گرد وغبار کو	پھر وہ درمیان میں گھس جاتے ہیں اس وقت

جَمْعًا ۙ﴿۵﴾	اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ	لَكَنُوْدٌ ۚ﴿۶﴾	وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ	لَشَهِيْدٌ ۚ﴿۷﴾
کسی جماعت کے	بیشک انسان اپنے رب کے لیے	یقیناً انتہائی ناشکرا ہے	حالانکہ بیشک وہ اس (بات) پر	یقیناً معائنہ کرنے والا ہے

وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ	لَشَدِيْدٌ ۭ﴿۸﴾	اَفَلَا يَعْلَمُ	اِذَا بُعْثِرَ	مَا فِي الْقُبُوْرِ ۙ﴿۹﴾
اور بیشک وہ مال کی محبت کے لیے	یقیناً بہت سخت ہے	تو کیا وہ جانتا نہیں (اُس وقت کو)	جب کریدا جائے گا	اس کو جو قبروں میں ہے

وَحُصِّلَ مَا	فِي الصُّدُوْرِ ۙ﴿۱۰﴾	اِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ	يَوْمَىِٕذٍ لَّخَبِيْرٌ ۧ﴿۱۱﴾
اور حاصل کرلیا جائے گا اس کو جو	سینوں میں ہے	بیشک ان کا رب ان کے بارے میں	اس دن یقیناً خبر رکھنے والا ہے

نوٹ:1

قرآن مجید جس چیز کی قسم کھا کر کوئی مضمون بیان فرماتا ہے تو اس چیز کو اس مضمون کے ثبوت میں دخل ہوتا ہے۔یہاں جنگی گھوڑوں کی خدمات کا ذکر اس بات کی شہادت میں میں لایا گیا ہے کہ انسان بڑا ناشکرا ہے۔تشریح اس کی یہ ہے کہ جنگی گھوڑے میدان جنگ میں انسان کے حکم اور اشارے کے تحت اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر کیسی کیسی سخت خدمات انجام دیتے ہیں۔حالانکہ انسان نے ان گھوڑوں کو پیدا نہیں کیا۔ انسان ان کو جو گھاس، دانہ وغیرہ دیتا ہے وہ بھی اس کا پیدا کیا ہوا نہیں ہے۔اس کا کام صرف اتنا ہے کہ اللہ کے پیدا کیے ہوئے رزق کو ان تک پہنچانے کا ایک واسطہ بنتا ہے۔اب گھوڑے کو دیکھیں کہ وہ انسان کے اتنے سے احسان کو کیسا پہچانتا اور مانتا ہے کہ اس کے ایک اشارے پر اپنی جان کو خطرے میں ڈال دیتا ہے۔اس کے بالمقابل انسان ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے ایک حقیر قطرے سے پیدا کیا، اس کو مختلف کاموں کی قوت بخشی، اس کے کھانے پینے کی ہر چیز پیدا فرمائی اور اس کی تمام ضروریات کو اس تک پہنچا دیا مگر وہ ان تمام احسانات کا شکر گزار بننے کے لیے آمادہ نہیں ہوتا۔(معارف القرآن)۔

نوٹ:2

یہاں انسان کے متعلق دو باتیں کہی گئی ہیں۔ایک یہ کہ وہ تکلیفوں کو یاد رکھتا ہے اور نعمتوں اور احسانات کو بھول جاتے ہیں۔دوسرے یہ کہ وہ مال کی محبت میں شدید ہے۔یہ دونوں باتیں شرعاً اور عقلاً مذموم ہیں۔ناشکری کا مذموم ہونا تو بالکل ظاہر ہے لیکن مال کی محبت کو بھی مذموم قرار دیا گیا ہے حالانکہ اس پر انسانی ضروریات کا مدار ہے اور اس کے کسب و اکتساب کو شریعت نے صرف حلال ہی نہیں بلکہ بقدر ضرورت فرض قرار دیا ہے۔تو مال کی محبت کا مذموم ہونا اس اعتبار سے ہے کہ انسان مال کی محبت سے اتنا مغلوب ہو جائے کہ اللہ کے احکام سے غافل ہو جائے اور

حلال وحرام کی پرواہ نہ رہے۔ اس لیے مال کو کمانا اور بقدر ضرورت جمع کرنا تو مذموم نہیں بلکہ فرض ہے لیکن دل میں اس کی محبت ہونا مذموم ہے۔ جیسے انسان بیماری میں دوا بھی پیتا ہے، آپریشن بھی کراتا ہے مگر دل میں ان چیزوں کی محبت نہیں ہوتی بلکہ بدرجۂ مجبوری اور بقدر ضرورت کرتا ہے۔ اسی طرح اللہ کے نزدیک مومن کو ایسا ہونا چاہیے کہ بقدر ضرورت مال کو حاصل بھی کرے، اس کی حفاظت بھی کرے اور ضرورت پر اس سے کام بھی لے مگر دل اس کے ساتھ مشغول نہ ہو۔ جیسا کہ مولانا رومیؒ نے فرمایا: کہ پانی جب تک کشتی کے نیچے رہے تو وہ کشتی کا مددگار ہے مگر یہی پانی جب کشتی کے اندر آجائے تو کشتی کو لے ڈوبتا ہے۔ اسی طرح مال جب تک دل کی کشتی کے اردگرد ہے تو مفید ہے لیکن جب دل کے اندر گھس گیا تو ہلاکت ہے۔ (معارف القرآن)۔

مال و دولت کے متعلق اسلام کا یہ وہ متوازن طرز فکر اور طرز عمل ہے جو ہمارے پروردگار کو مطلوب ہے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اس کو بیان کرنا اور اس کی تلقین کرنا جتنا آسان ہے، اس کو اپنانا اور لائف اسٹائل بنانا اتنا ہی مشکل ہے۔ یہ اس دنیا کا پل صراط ہے، بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز۔ کوئی مائی کا لعل گزر نہیں سکتا، اللہ اگر توفیق نہ دے۔ اس لیے اسی کے آگے گڑگڑاتے رہنا چاہیے، اسی سے توفیق و تائید مانگتے رہنا چاہیے۔ یہ لائف اسٹائل اختیار کرنا نسبتاً آسان ہے۔ اور اللہ جب اس راہ کا راہی بنائے تو پھر کہہ دینا چاہیے ﴿حَسْبِيَ اللّٰهُ ڮ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ؑ﴾ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص صبح اور شام اس آیت کو سات سات بار پڑھے گا اللہ تعالیٰ اس کو دین اور دنیا کی فکروں سے نجات دے دے گا۔ (حدیث منقول از صحیفۂ اہل حدیث، ۔ ۷۔ جنوری ۲۰۱۱ء۔ مرتب)۔

نوٹ: 3 آیت۔ 10۔ کا مطلب یہ ہے کہ ظاہری افعال کے پیچھے جو باطنی محرکات (MOtives) چھپے ہوئے ہیں وہ سب کھول کر رکھ دیئے جائیں گے اور ان کی جانچ پڑتال کر کے اچھائی برائی کو الگ الگ کر دیا جائے گا۔ یعنی فیصلہ صرف ظاہر ہی کو دیکھ کر نہیں کیا جائے گا کہ انسان نے عملاً کیا کچھ کیا۔ بلکہ دلوں میں چھپے ہوئے رازوں کو نکال کر دیکھا جائے گا کہ انسان نے جو کام کیے وہ کس نیت اور کس غرض سے کیے۔ اس بات پر اگر انسان غور کرے تو وہ یہ تسلیم کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اصلی اور مکمل انصاف خدا کی عدالت کے سوا اور کہیں نہیں ہو سکتا۔ دنیا کے لادینی قوانین بھی اصولی حیثیت سے ضروری سمجھتے ہیں کہ کسی شخص کے محض ظاہری فعل کی بنا پر اسے سزا نہ دی جائے بلکہ یہ بھی دیکھا جائے کہ اس نے کس نیت سے وہ فعل کیا۔ لیکن دنیا کی کسی عدالت کے پاس وہ ذرائع نہیں ہیں جن سے وہ نیت کی ٹھیک ٹھیک تحقیق کر سکے۔ یہ صرف اور صرف خدا ہی کر سکتا ہے کہ الفاظ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ فیصلہ محض اللہ کے اس علم کی بنا پر نہیں ہوگا جو وہ دلوں کے ارادوں اور نیتوں کے بارے میں پہلے ہی سے رکھتا ہے، بلکہ قیامت کے روز اس رازوں کو کھول کر سامنے رکھ دیا جائے گا اور کھلی عدالت میں یہ دکھایا جائے گا کہ ان میں خیر کیا تھی اور شر کیا تھا۔ (تفہیم القرآن)۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سورۃ القارعہ (101)

آیت نمبر (1 تا 8)

اَلْقَارِعَةُ ۙ﴿۱﴾	مَا الْقَارِعَةُ ۚ﴿۲﴾	وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ ۭ﴿۳﴾
کھٹکھٹانے والی	کیا ہے کھٹکھٹانے والی	اور تو نے کیا سمجھا کیا ہے کھٹکھٹانے والی

يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ	كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ ۙ﴿۴﴾	وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ
جس دن ہو جائیں گے لوگ	بکھیرے ہوئے پتنگوں کی مانند	اور ہو جائیں گے سارے پہاڑ

كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ ۭ﴿۵﴾	فَاَمَّا مَنْ	ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ۙ﴿۶﴾	فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۭ﴿۷﴾
دُھنی ہوئی رنگین اون کی مانند	پس وہ جو ہے	بھاری ہوئے جس کے ترازو (پلڑے)	تو وہ من بھاتی زندگی گزارنے میں ہے

وَاَمَّا مَنْ	خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ۙ﴿۸﴾	فَاُمُّهٗ
اور وہ جو ہے	ہلکے ہوئے جس کے ترازو (پلڑے)	تو اس کی ماں (گود)

هَاوِيَةٌ ۭ﴿۹﴾	وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا هِيَهْ ۭ﴿۱۰﴾	نَارٌ حَامِيَةٌ ۧ﴿۱۱﴾
ایک نیچے اترنے والی (جگہ۔گڑھا) ہے	ارتو نے سمجھا کیا ہے وہ (جگہ)	(وہ) ایک دہکنے والی آگ ہے

نوٹ: 1

قَارِعَةٌ کا لفظی ترجمہ ہے ٹھونکنے والی۔ یہ لفظ ہولناک حادثہ اور بڑی بھاری آفت کے لیے بولا جاتا ہے۔ یہاں یہ لفظ قیامت کے لیے استعمال کیا گیا ہے اور اِن آیات میں قیامت کے پہلے مرحلے سے لے کر عذاب وثواب کے آخری مرحلے تک کو یک جا کر دیا گیا ہے۔ پہلی پانچ آیات میں قیامت کے پہلے مرحلے کا ذکر ہے جب وہ حادثۂ عظیم (اَلْقَارِعَةُ) برپا ہوگا جس کے نتیجے میں دنیا کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ اس وقت لوگ گھبراہٹ کے عالم میں اس طرح بھاگے پھریں گے جیسے روشنی پر آنے والے پروانے ہر طرف پراگندہ ومنتشر ہوتے ہیں اور پہاڑ دھنکے ہوئے اُون کی طرح ہوں گے۔ پھر اگلی آیات میں اس مرحلے کا ذکر ہے جب دوبارہ زندہ ہو کر لوگ اللہ تعالیٰ کی عدالت میں پیش ہوں گے۔ (تفہیم القرآن)۔

يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ ۙ کا ایک مطلب یہ بھی لیا گیا ہے کہ یہ اس وقت کی کیفیت کا بیان ہے جب لوگ دوبارہ زندہ ہو کر قبروں سے نکلیں گے۔ لیکن اگلی آیت میں پہاڑوں کی جس کیفیت کا بیان ہے اس کی بنیاد پر یہ رائے زیادہ قرین قیاس نہیں ہے۔ (مرتب)۔

اعمال کے وزن کی وضاحت الاعراف کی آیات۔8۔9۔ کے نوٹ۔2 میں کی جا چکی ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سورۃ التکاثر (102)

آیت نمبر (1 تا 8)

ترکیب

(آیت۔1) تَكَاثُرُ باب تفاعل کا مصدر ہے اس لیے اس میں باہم ایک دوسرے پر کثرت حاصل کرنے کا مفہوم شامل ہے۔ اور یہ اَلْهٰى کا فاعل ہونے کی وجہ سے حالتِ رفع میں ہے۔ جس چیز میں کثرت کی خواہش نے انسان کو غافل کیا وہ یہاں محذوف ہے اس لیے اس کے مفہوم میں وسعت ہے۔ دنیوی ساز وسامان نے جس چیز سے انسان کو غافل کیا وہ بھی محذوف ہے۔ جو آخرت بھی ہو سکتی ہے، ذکر اللہ بھی ہو سکتا ہے۔

(آیت۔7) تَعْلَمُوْنَ کا مفعول ہونے کی وجہ سے عِلْمَ الْيَقِيْنِ حالتِ نصب میں ہے۔ ثُمَّ لَتَرَوُنَّ کا مفعول هَا ضمیر ہے

اور عَيْنَ الْيَقِيْنَ حال ہونے کی وجہ سے حالتِ نصب میں ہے۔ عِلْمَ الْيَقِيْنِ اور عَيْنَ الْيَقِيْنِ دونوں مرکب اضافی ہیں لیکن اضافت کے ساتھ ترجمہ کرنے سے ان اصطلاحات کا مفہوم واضح نہیں ہوتا اس لیے ان کا ترجمہ اردو محاورے کے مطابق ہوگا۔ (آیت۔8) اَلنَّعِيْمِ پر لام جنس ہے۔

ترجمہ

اَلْهٰكُمُ	التَّكَاثُرُ ۙ﴿۱﴾	حَتّٰى زُرْتُمُ
غافل کیا تم لوگوں کو (اللہ کی یاد سے)	ایک دوسرے پر کثرت کرنے نے (دنیوی سامان میں)	یہاں تک کہ زیارت کی تم لوگوں نے

الْمَقَابِرَ ﴿۲﴾	كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ﴿۳﴾	ثُمَّ كَلَّا	سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۴﴾
قبرستانوں کی	ہرگز نہیں! عنقریب جان لوگے	پھر (مکرر) ہرگز نہیں!	عنقریب تم لوگ جان لوگے

كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ	عِلْمَ الْيَقِيْنِ ﴿۵﴾	لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ۙ﴿۶﴾
ہرگز نہیں! کاش تم لوگ جانتے ہوتے	(بتائے ہوئے) علم پر یقین (کی اہمیت) کو	(تو اب) تم لوگ لازماً دیکھو گے دوزخ کو

ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا	عَيْنَ الْيَقِيْنِ ۙ﴿۷﴾	ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَىِٕذٍ	عَنِ النَّعِيْمِ ﴿۸﴾ ع
پھر تم لوگ لازماً دیکھو گے اس کو	دیکھنے پر یقین کرتے ہوئے	پھر تم سے لازماً پوچھا جائے گا اس دن	تمام نعمتوں کے بارے میں

نوٹ:1 تکاثر کا مطلب ہے کثرت کے ساتھ مال و دولت جمع کرنا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ سورۃ پڑھ کر فرمایا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ مال کو ناجائز طریقوں سے حاصل کیا جائے اور مال پر جو فرائض اللہ کے عائد ہوئے ہیں ان میں خرچ نہ کریں۔ (معارف القرآن)۔

نوٹ:2 مسجد خالد، لاہور کے پہلے خطب کرنل اختر مرحوم نے ایک مثال کے ذریعے علم الیقین اور عین الیقین کا فرق اس طرح واضح کیا کہ ایک عام آدمی بھی بڑی آسانی سے اس کو سمجھ لیتا ہے۔ مثال یہ ہے کہ دو آدمی بازار سے ہو کر اپنے گھر جا رہے تھے۔ کسی نے ان کو اطلاع دی کہ اس راستے پر آگے تمہارا دشمن بیٹھا ہے۔ اس راستے سے مت جاؤ۔ ایک آدمی نے اس اطلاع پر یقین کر لیا اور راستہ بدل کر بخیریت پہنچ گیا۔ دوسرے آدمی نے یقین نہیں کیا۔ آگے جا کر جب وہ دشمن کے ہتھے چڑھ گیا تب اس کو یقین آیا اس مثال میں ایک اَن دیکھی حقیقت کا علم دونوں کو دیا گیا۔ پہلے آدمی نے اس علم پر یقین کر لیا۔ اس کو علم الیقین کہتے ہیں۔ اس کا سب سے اہم فائدہ یہ ہے کہ اس علم سے فائدہ اٹھانے یا کسی خطرے سے بچاؤ کرنے کے لیے عمل کرنے کا موقع باقی رہتا ہے۔ دوسرے آدمی نے علم پر یقین نہیں کیا۔ آگے جا کر جب اس کو دشمن نظر آیا تو اس کو یقین آ گیا۔ اس کو عین الیقین تو حاصل ہو جائے گا لیکن اس کا فائدہ کوئی نہیں ہوگا۔ اس حوالہ سے اس بات کو ذہن نشین کر لیں کہ سارا اجر و ثواب علم الیقین پر ہے اور اسی کا دوسرا نام ایمان بالغیب ہے۔ جدید تعلیم یافتہ کچھ لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ایمان بالغیب کا مطالبہ غیر فطری ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ مطالبہ فطرتِ انسانی کے عین مطابق ہے کیونکہ غیب پر ایمان لانے کی صلاحیت انسان کی فطرت میں ودیعت شدہ (Inbuilt) ہے۔ اس کی تشریح آیت۔2 / البقرۃ:3، نوٹ۔2 میں کی جا چکی ہے۔

2029

2029

2029

2029

2029

2029

2029

2029

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

2050

سورۃ العصر (103)

آیت نمبر (1 تا 3)

ترجمہ

وَالۡعَصۡرِ ۙ﴿۱﴾	اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ ۙ﴿۲﴾	اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا
قسم ہے زمانے کی	بیشک تمام انسان یقیناً خسارے میں ہیں	سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے

وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	وَتَوَاصَوۡا بِالۡحَقِّ ۙ	وَتَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ ﴿۳﴾
اور انہوں نے عمل کیے نیکیوں کے	اور باہم تاکید کی اس حق (دین) کی	اور باہم تاکید کی ثابت قدم رہنے کی

نوٹ: 1

العصر (زمانہ) لفظ گزرے ہوئے زمانے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور گزرتے ہوئے زمانے کے لیے بھی جسے حال کہتے ہیں۔ گزرے ہوئے زمانے کی قسم کھانے کا مطلب یہ ہے کہ انسانی تاریخ اس بات کی شہادت دے رہی ہے کہ جو لوگ بھی اِن صفات سے خالی تھے وہ بالآخر خسارے میں پڑ کر رہے۔ اور گزرتے ہوئے زمانے کی قسم کا مطلب سمجھنے کے لیے پہلے یہ بات سمجھ لیں کہ جو زمانہ اب گزر رہا ہے یہ دراصل وہ وقت ہے جو ہر ایک شخص کو دنیا میں کام کرنے کے لیے دیا گیا ہے۔ اس کی مثال اس وقت کی سی ہے جو امتحان کے کمرے میں طالب علم کو پرچے حل کرنے کے لیے دیا جاتا ہے۔ یہ وقت جس تیز رفتاری سے گزر رہا ہے اس کا اندازہ تھوڑی دیر کے لیے اپنی گھڑی میں سیکنڈ کی سوئی کو حرکت کرتے ہوئے دیکھنے سے آپ کو ہو جائے گا۔ پس گزرتے ہوئے زمانے کی قسم کھا کر جو بات اس سورہ میں کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ یہ تیز رفتار زمانہ شہادت دے رہا ہے کہ ان چار صفات سے خالی ہو کر انسان جن کاموں میں بھی اپنی مہلت عمر صرف کر رہا ہے وہ سب کے سب خسارے کے سودے ہیں۔ نفع میں صرف وہ لوگ ہیں جو ان چاروں صفات سے متصف ہو کر دنیا میں کام کریں۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ: 2

اس سورہ میں خسارے سے بچنے کے لیے جن چار صفات کا ذکر ہے وہ یہ ہیں ایمان۔ عملِ صالح۔ تواصی بالحق۔ تواصی بالصبر۔ ان میں ایمان اور عمل صالح خود انسان کی ذات سے متعلق ہیں۔ ان کا معاملہ واضح ہے اور کسی تشریح کا محتاج نہیں، البتہ تواصی بالحق اور تواصی بالصبر قابل غور ہیں۔ تواصی کا لفظ وصیت سے بنا ہے۔ کسی شخص کو تاکید کے ساتھ مؤثر انداز میں نصیحت کرنے کا نام وصیت ہے۔ اسی وجہ سے مرنے والا اپنے بعد کے لیے جو ہدایات دیتا ہے اس کو بھی وصیت کہا جاتا ہے۔ لفظ حق اور صبر کے معنی میں ایک احتمال یہ ہے کہ حق سے مراد صحیح عقائد اور اعمال صالحہ کا مجموعہ ہو اور صبر سے مراد تمام گناہوں اور بُرے کاموں سے بچنا ہو۔ ایسی صورت میں حق کا حاصل امر بالمعروف ہو گیا اور صبر کا حاصل نہی عن المنکر ہو گیا، یعنی وہ ایمان اور عمل صالح جس کو انسان نے خود اختیار کیا ہے اس کی تاکید اور نصیحت دوسروں کو کرنا۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ حق سے مراد صحیح اعتقادات لیے جائیں اور صبر کے مفہوم میں تمام نیک اعمال کی پابندی اور بُرے کاموں سے بچنا شامل ہو۔ حافظ ابن تیمیہ کے ایک رسالے کی تحریر کا خلاصہ یہ ہے کہ تواصی بالحق سے مراد دوسرے مسلمانوں کی علمی اصلاح ہے اور تواصی بالصبر سے مراد عملی اصلاح ہے۔

اس لحاظ سے اس سورہ میں مسلمانوں کو ایک بہت بڑی ہدایت دی گئی ہے اور وہ یہ ہے کہ ان کا اپنے عمل کو قرآن وسنت کے تابع کر لینا جتنا اہم اور ضروری ہے اتنا ہی اہم اور ضروری یہ بھی ہے کہ دوسرے مسلمانوں کو بھی ایمان اور عمل صالح کی طرف بلانے کی مقدور بھر کوشش

کرے ورنہ صرف اپنا عمل نجات کے لیے کافی نہ ہوگا۔ خاص طور سے اپنے اہل وعیال، متعلقین اور احباب کے بُرے اعمال 2050 سے غفلت برتنا اپنی نجات کا راستہ بند کرنا ہے، اگرچہ خود وہ کیسے ہی اعمال صالحہ کا پابند ہو۔ اس معاملہ میں عام مسلمان بلکہ بہت سے خواص تک غفلت میں مبتلا ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس ہدایت پر عمل کی توفیق نصیب فرمادے۔ (معارف القرآن)۔

آج (۱۴۳۲ھ۔ ۲۰۱۱ء) کے پاکستانی معاشرے کا المیہ یہ ہے کہ یہ معاملہ اب غفلت برتنے سے بہت آگے نکل گیا ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو، اور اس میں بھی خاص طور سے نہی عن المنکر کو ہم لوگ دوسروں کے ذاتی معاملات میں دخل اندازی سمجھ کر معیوب سمجھتے رہے۔ پھر جب بات اس سے بھی آگے بڑھی تو پہیہ اُلٹا گھومنا شروع ہوگیا۔ یعنی اب ہم لوگ نہی عن المنکر کے فریضے کو نہ صرف اپنے لیے معیوب سمجھتے ہیں بلکہ یہ فریضہ سرانجام دینے والے کو اس کام سے منع کرتے ہیں اور اپنے مقدور بھر روکنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ الا ماشاء اللہ۔ ہمارا دوسرا المیہ یہ ہے کہ اگر کچھ لوگ یہ فریضہ سرانجام دینے کے لیے کمربستہ ہوتے ہیں تو پھر وہ داروغہ بن بیٹھتے ہیں حالانکہ اللہ نے اس کی اجازت اپنے حبیب ﷺ کو بھی نہیں دی تھی۔ ان دونوں انتہائی (Extereme) رویوں کی بنیادی وجہ ایک ہی ہے، اور وہ یہ کہ اس فریضے کو سرانجام دینے کے لیے قرآن وحدیث کا مطلوبہ متوازن طرز عمل ہمارے ذہنوں سے اوجھل ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہم میں سے جو لوگ اس کو فرض سمجھتے بھی ہیں تو انہوں نے اس کو فرض کفایہ یعنی مولوی لوگوں کی ذمہ داری قرار دے کر خود کو فارغ کرلیا ہے۔ حالانکہ یہ فرض عین ہے یعنی فرداً فرداً ہر شخص پر اس کے ظروف واحوال کے مطابق فرض ہے۔ اسی ذہنی خلا کو پر کرنے کی نیت سے کچھ عرصہ پہلے فاؤنڈیشن کے میگزین میں شائع ہونے والے چند مضامین کو یکجا کر کے ''اصلاحِ معاشرہ'' کے عنوان سے شائع کر کے تقسیم کیا گیا تھا پھر اسے جینے کا سلیقہ کورس میں شامل کر دیا گیا۔ جن طلبا کے پاس یہ کتابچہ نہیں ہے وہ اپنے رول نمبر کے حوالے سے یہ کتابچہ بلا معاوضہ طلب کرلیں۔

اس ضمن میں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ اوپر معارف القرآن کی عبارت میں کہا گیا ہے کہ اس فریضہ سے پہلوتہی کرنا اپنی نجات کا راستہ بند کرنا ہے۔ یہاں نجات کا مطلب یہ ہے کہ بندے کو میدان حشر سے براہِ راست جنت میں داخلے کا پروانہ نصیب ہوجائے۔ اس میں اس عقیدے کی نفی نہیں ہے کہ گنہگار اہل ایمان اپنے گناہوں کے بمقدار سزا بھگتنے کے بعد دوزخ سے نکال لیے جائیں گے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ الھمزۃ (104)

آیت نمبر (1 تا 9)

ترکیب

(آیات۔ 1 تا 4) هُمَزَةٌ۔ لُمَزَةٌ۔ حُطَمَةٌ یہ تینوں الفاظ اسمائے صفت ہیں اور ان تینوں پر تائے مبالغہ ہے۔ (آیت۔ 3) اَنَّ کا اسم مَالَهٗ ہے اس لیے یہ حالت نصب میں ہے اور یہ اَخۡلَدَ کا فاعل ہے۔ اس سے متصل هٗ کی ضمیر مفعولی گزشتہ آیت میں اَلَّذِیۡ کے لیے ہے۔ (آیت۔ 6) نَارُ اللّٰهِ خبر ہے۔ اَلۡمُوۡقَدَةُ۔ نَارُ کی صفت ہے اس لیے اس پر تائے تانیث ہے۔ اس خبر کا مبتدا هِیَ محذوف ہے۔ (آیت۔ 8) اِنَّ کا اسم اس کے ساتھ هَا کی ضمیر ہے جو نَارٌ کے لیے ہے۔ مُّؤۡصَدَةٌ اس کی خبر ہے اس لیے اس پر تائے تانیث ہے۔ (آیت۔ 9) فِیۡ عَمَدٍ متعلق خبر ہے اِنَّهَا کی اور مُّمَدَّدَةٍ صف ہے عَمَدٍ، جو جمع مکسر ہے۔ اس لیے اس کی صفت واحد مؤنث آئی ہے۔

ترجمہ

2050

وَيۡلٌ لِّكُلِّ	هُمَزَةٍ	لُّمَزَةِ ۙ۝١	الَّذِيۡ جَمَعَ مَالًا
تباہی ہے ہر ایک	بہت طعنہ زنی کرنے والے	بہت عیب جوئی کرنے والے کے لیے	جس نے جمع کیا کچھ مال

وَّعَدَّدَهٗ ۙ۝٢	يَحۡسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ	اَخۡلَدَهٗ ۚ۝٣	كَلَّا لَيُنۡۢبَذَنَّ
اور وہ بار بار گنتا رہا اس کو	وہ گمان کرتا ہے کہ اس کا مال	دوام بخشے گا اس کو	ہرگز نہیں! اُس (شخص) کو لازماً پھینکا جائے گا

فِى الۡحُطَمَةِ ۖ۝٤	وَمَاۤ اَدۡرٰٮكَ	مَا الۡحُطَمَةُ ؕ۝٥	نَارُ اللّٰهِ الۡمُوۡقَدَةُ ۙ۝٦
اُس بہت روندنے والی میں	اور تونے کیا سمجھا	کیا ہے وہ بہت روندنے والی	(وہ) اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے

الَّتِىۡ تَطَّلِعُ عَلَى الۡاَفۡـِٕدَةِ ؕ۝٧	اِنَّهَا عَلَيۡهِمۡ	مُّؤۡصَدَةٌ ۙ۝٨	فِىۡ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ۝٩
جو چڑھتی ہے دلوں پر	بیشک وہ (آگ) ان پر	اوپر سے بند کی ہوئی ہے	دراز کیے ہوئے ستونوں میں

نوٹ:1

سابق سورۃ العصر اور اس سورہ کے مضمون میں نہایت واضح مناسبت یہ ہے کہ سابق سورہ میں فلاح پانے والے انسانوں کا کردار بیان ہوا ہے اور اس سورہ میں اس کے بالکل ضد کردار بیان ہوا ہے جو روپیہ گن گن کر رکھتے ہیں اور لوگوں کے حقوق ادا کرنا تو درکنار، کسی کو اگر دیکھ پائیں کہ وہ ادائے حقوق کے معاملے میں عملاً وقولاً سرگرم ہے تو اپنے طعن وطنز سے اسے تنگ کرتے ہیں۔ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ کسی طرح اس کا حوصلہ پست کردیں تاکہ ان کی بخالت پر پردہ پڑا رہے اور ان کو خفت وندامت سے دوچار نہ ہونا پڑے۔ قرآن نے بخیل سرمایہ داروں کے اس کردار کی طرف جگہ جگہ اشارہ کیا ہے۔ مثلاً سورۃ توبہ کی آیت۔ 49۔ میں ہے۔ ’’جو لوگ خوش دلی سے انفاق کرنے والے اہل ایمان پر ان کے صدقات کے باب میں نکتہ چینی کرتے ہیں اور جو غریب اپنی محنت مزدوری سے انفاق کرتے ہیں، ان پر پھبتیاں چست کرتے ہیں، اللہ نے ان لوگوں کا مذاق اڑایا اور ان کے لیے ایک دردناک عذاب ہے۔‘‘ (تدبر قرآن)۔

نوٹ:2

اس سورہ کو اگر ان سورتوں کے تسلسل میں رکھ کر دیکھا جائے جو سورہ زلزال سے یہاں تک چلی آرہی ہیں تو آدمی بڑی اچھی طرح یہ سمجھ سکتا ہے کہ مکہ معظمہ کے ابتدائی دور میں کس طریقے سے اسلام کے عقائد اور اس کی تعلیمات کو لوگوں کے ذہن نشین کیا گیا تھا۔ سورۂ زلزال میں بتایا گیا کہ کوئی ذرہ برابر نیکی یا بدی ایسی نہ ہوگی جو اس نے دنیا میں کی ہو اور وہ آخرت میں اس کے سامنے نہ آجائے۔ سورہ عادیات میں اس کشت وخون اور غارت گری کی طرف اشارہ کیا گیا جو عرب میں ہر طرف برپا تھی۔ پھر یہ احساس دلانے کے بعد کہ خدا کی دی ہوئی طاقتوں کا یہ استعمال اس کی بہت بڑی ناشکری ہے، لوگوں کو بتایا گیا کہ یہ معاملہ اسی دنیا میں ختم نہیں ہو جائے گا بلکہ موت کے بعد دوسری زندگی میں صرف افعال ہی کی نہیں بلکہ نیتوں تک کی جانچ پڑتال ہوگی۔ سورۂ قارعہ میں قیامت کا نقشہ پیش کرنے کے بعد لوگوں کو خبردار کیا گیا کہ آخرت میں انسان کے انجام کا انحصار اس پر ہوگا کہ اس کی نیکیوں کا پلڑا بھاری ہے یا ہلکا۔ سورۂ تکاثر میں اس ذہنیت پر گرفت کی گئی جس کی وجہ سے لوگ مرتے دم تک دنیا کے عیش وآرام اور جاہ ومنزلت میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ پھر اس کے بُرے انجام سے آگاہ کیا گیا کہ ایک ایک نعمت جو یہاں تمہیں مل رہی ہے اس کے لیے تمہیں اپنے رب کو جواب دینا ہوگا کہ اسے کیسے حاصل کیا اور کہاں استعمال کیا۔ سورۂ عصر میں بتادیا گیا کہ نوع انسانی کا ایک ایک فرد خسارے میں ہے اگر اس میں مذکورہ چار صفات نہ ہوں۔ اس کے بعد یہ سورہ آئی ہے جس

میں جاہلیت کی سرداری کا ایک نمونہ پیش کر کے لوگوں کے سامنے گویا یہ سوال رکھ دیا گیا کہ یہ کردار خسارے میں کیوں نہ ہو۔ (تفہیم القرآن)۔ 2050

نوٹ:3 آیت۔3۔ کا ایک مطلب یہ ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال اسے حیاتِ جاوداں بخش دے گا یعنی دولت جمع کرنے اور اسے گن گن کر رکھنے میں وہ ایسا منہمک ہے کہ اسے اپنی موت یاد نہیں رہی اور اسے کبھی یہ خیال بھی نہیں آتا کہ ایک وقت یہ سب کچھ چھوڑ کر خالی ہاتھ دنیا سے رخصت ہونا ہے۔

آیت۔7۔ میں اَلۡاَفۡـِٕدَةِ کا لفظ آیا ہے جو فواد کی جمع ہے اور جس کے معنی دل کے ہیں۔ لیکن یہ لفظ اس عضو کے لیے استعمال ہوتا ہے جو انسان کے شعور وادراک، جذبات وخواہشات، عقائد وافکار اور نیتوں اور ارادوں کا مقام ہے۔ دلوں تک اس آگ کے پہنچنے کا ایک مطلب یہ ہے کہ یہ آگ اس جگہ تک پہنچے گی جو انسان کے فاسد عقائد اور ناپاک خواہشات وجذبات کا مرکز ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی وہ آگ دنیا کی آگ کی طرح اندھی نہیں ہوگی کہ مستحق اور غیر مستحق سب کو جلا دے بلکہ وہ ایک ایک مجرم کے دل تک پہنچ کر ہر ایک کو اس کے جرم کے مطابق عذاب دے گی۔ (تفہیم القرآن)۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

سورۃ الفیل (105)

آیت نمبر (1 تا 5)

اَلَمۡ يَجۡعَلۡ كَيۡدَهُمۡ	بِاَصۡحٰبِ الۡفِيۡلِ ؕ﴿۱﴾	كَيۡفَ فَعَلَ رَبُّكَ	اَلَمۡ تَرَ
کیا اس نے نہیں کیا ان کے داؤ کو	ہاتھی والوں کے ساتھ	کیسا کیا تیرے رب نے	کیا تو نے غور نہیں کیا

اَبَابِيۡلَ ۙ﴿۳﴾	وَّ اَرۡسَلَ عَلَيۡهِمۡ طَيۡرًا	فِىۡ تَضۡلِيۡلٍ ۙ﴿۲﴾
جھنڈ در جھنڈ ہوتے ہوئے	اور اس نے بھیجے ان لوگوں پر کچھ پرندے	تباہ کرنے میں

فَجَعَلَهُمۡ كَعَصۡفٍ مَّاۡكُوۡلٍ ﴿۵﴾	بِحِجَارَةٍ مِّنۡ سِجِّيۡلٍ ۪ۙ﴿۴﴾	تَرۡمِيۡهِمۡ
پھر اس نے کر دیا ان کو کھائے ہوئے بھوسے کی مانند	کچھ پتھر مٹی کے پتھر میں سے	جو پھینکتے تھے ان پر

نوٹ:1 سورہ بروج کے نوٹ۔2۔ میں بیان کیا جا چکا ہے کہ یمن کے بادشاہ نے اللہ پر ایمان لانے والے عیسائیوں کو آگ میں زندہ جلا دیا تھا۔ اس ظلم کا بدلہ لینے کے لیے حبشہ کی عیسائی حکومت نے یمن پر حملہ کر دیا اور 525ء میں اس پورے علاقے پر حبشی حکومت قائم ہوگئی تھی یمن پر جو حبشی فوج حملہ آور ہوئی تھی اس کے دو سردار ارياط اور ابرہہ بعد میں آپس میں لڑ پڑے مقابلہ میں ارياط مارا گیا اور ابرہہ ملک پر قابض ہو گیا۔ یمن میں پوری طرح اپنا اقتدار مضبوط کر لینے کے بعد ابرہہ نے اس مقصد کے لیے کام شروع کیا جو ابتدا سے رومی سلطنت اور حبشی عیسائیوں کے پیش نظر تھا۔ یعنی عرب میں عیسائیت پھیلانا اور اس کی تجارت پر قبضہ کرنا جو بلادِ مشرق (یعنی انڈونیشا،

ہندوستان وغیرہ) اور رومی مقبوضات کے درمیان عربوں کے ذریعہ سے ہوتی تھی۔ اس مقصد کے لیے اس نے یمن کے دارالحکومت صنعا میں ایک عظیم الشان کلیسا (گرجا گھر) تعمیر کرایا۔ اس کی تکمیل کے بعد اس نے حبشہ کے بادشاہ کو لکھا کہ میں عربوں کا حج کعبہ سے اس کلیسا کی طرف موڑے بغیر نہ رہوں گا۔ اس نے یمن میں علی الاعلان اپنے اس ارادے کا اظہار کیا اور اس کی منادی کرادی۔ اسپر کسی عرب یا قریشی نے یا چند قریشی نوجوانوں نے مشتعل ہو کر کلیسا کو گندا کر دیا یا اس کو آگ لگائی۔ لیکن یہ بھی کچھ بعید نہیں کہ ابرہہ نے خود اپنے کسی آدمی سے ایسی کوئی حرکت کروائی ہو تا کہ اسے مکہ پر حملہ کرنے کا بہانہ مل جائے۔ بہرحال اس واقعہ کے بعد اس نے کعبہ کو ڈھا دینے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ ۵۷۰ء یا ۵۷۱ء میں وہ ساٹھ ہزار فوج اور تیرہ ہاتھی لے کر مکہ کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں دو عرب سرداروں نے اپنے اپنے لشکر جمع کر کے اس کا راستہ روکنے کی کوشش کی مگر دونوں کو شکست ہوئی۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ یہ لشکر جب عرفات کے قریب پہنچا تو حضرت عبدالمطلب اس کے پاس گئے اور کہا کہ آپ کو یہاں تک آنے کی کیا ضرورت تھی۔ آپ کو اگر کوئی چیز مطلوب تھی تو ہمیں کہلا بھیجتے ہم اسے لے کر خود آپ کے پاس حاضر ہو جاتے۔ اس نے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ یہ گھر امن کا گھر ہے، میں اس کا امن ختم کرنے آیا ہوں۔ حضرت عبدالمطلب نے کہا کہ یہ اللہ کا گھر ہے اور اس نے آج تک کسی کو اس پر مسلط نہیں ہونے دیا ہے۔ ابرہہ نے کہا ہم اس کو منہدم کیے بغیر نہیں پلٹیں گے۔ حضرت عبدالمطلب نے کہا کہ آپ جو کچھ چاہیں لے لیں اور واپس چلے جائیں۔ مگر ابرہہ نے انکار کر دیا اور اپنے لشکر کو آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں اونٹوں کے قصے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

یہ امر بالکل واضح ہے کہ مکہ اور اس کے آس پاس کے قبائل اتنی بڑی فوج سے لڑ کر کعبے کو بچانے کی طاقت نہ رکھتے تھے۔ اس لیے یہ بالکل قابل فہم بات ہے کہ قریش نے اس کی مزاحمت کی کوئی کوشش نہ کی۔ ابرہہ کے لشکر سے واپس آ کر حضرت عبدالمطلب نے قریش والوں سے کہا کہ اپنے بال بچوں کو لے کر پہاڑوں میں چلے جائیں تا کہ ان کا قتل عام نہ ہو جائے۔ پھر وہ قریش کے چند سرداروں کو لے کر حرم میں حاضر ہوئے اور کعبے کے دروازے کا کُنڈا پکڑ کر انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگیں کہ وہ اپنے گھر اور اس کے خادموں کی حفاظت فرمائے۔ اس وقت خانۂ کعبہ میں ۳۶۰ بت موجود تھے لیکن اس وقت یہ لوگ ان سب کو بھول گئے اور انہوں نے صرف اللہ کے آگے دست سوال پھیلایا۔ ان کی جو دعائیں تاریخوں میں منقول ہیں ان میں اللہ واحد کے سوا کسی دوسرے کا نام تک نہیں پایا جاتا۔ دعائیں مانگ کر حضرت عبدالمطلب اور ان کے ساتھی بھی پہاڑوں میں چلے گئے۔

دوسرے روز ابرہہ مکہ میں داخل ہونے کے لیے آگے بڑھا مگر اس کا خاص ہاتھی محمود، جو آگے آگے تھا یکایک بیٹھ گیا۔ اس کو بہت تبر مارے گئے، آنکسو سے کچوکے دیئے گئے یہاں تک کہ اسے زخمی کر دیا گیا مگر وہ نہ ہلا۔ اسے کسی اور سمت موڑ کر چلاتے تو وہ دوڑنے لگتا مگر مکہ کی طرف موڑا جاتا تو فوراً بیٹھ جاتا اور کسی طرح آگے بڑھنے کے لیے تیار نہ ہوتا۔ اتنے میں پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ اپنی چونچوں اور پنجوں میں کنکریاں لیے ہوئے آئی اور لشکر پر ان کی بارش کر دی۔ جس پر یہ کنکر گرتے اس کا جسم گلنا شروع ہو جاتا اور ہڈیاں نکل آتیں۔ خود ابرہہ کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ ان لوگوں نے یمن کی طرف بھاگنا شروع کیا۔ سب کے سب اسی وقت ہلاک نہیں ہوئے۔ کچھ تو وہیں ہلاک ہوئے اور کچھ بھاگتے ہوئے راستے بھر گرتے چلے گئے، ابرہہ بھی خثعم کے علاقے میں پہنچ کر مرا۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں عرب کے دوسرے سردار نے اس کا راستہ روکنے کی کوشش کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے حبشیوں کو صرف یہی سزا دینے پر اکتفا نہ کیا بلکہ تین چار سال کے اندر یمن سے حبشی اقتدار ہمیشہ

کے لیے ختم کر دیا۔ واقعہ فیل کے بعد یمن میں ان کی طاقت ٹوٹ گئی۔ جگہ جگہ یمنی سردار علم بغاوت لے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ایک یمنی سردار 2050 نے شاہ ایران سے فوجی مدد طلب کر لی۔ ایران سے صرف ایک ہزار فوج چھ جہازوں کے ساتھ آئی تھی جو حبشی حکومت کا خاتمہ کر دینے کے لیے کافی ہوگئی۔ یہ ۵۷۵ء کا ہے۔

یہ اتنا بڑا واقعہ تھا جس کی تمام عرب میں شہرت ہوگئی۔ بہت سی شعراء نے قصائد کہے۔ ان تمام قصائد میں یہ بات بالکل نمایاں ہے کہ سب نے اسے اللہ تعالیٰ کی قدرت کا اعجاز قرار دیا اور کہیں اشارہ و کنایۃً بھی یہ نہیں کہا کہ اس میں ان بتوں کا بھی کوئی دخل تھا جو کعبہ میں پوجے جاتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قریش نے دس سال تک اللہ وحدہٗ لاشریک کے سوا کسی کی عبادت نہ کی۔ جس سال یہ واقعہ پیش آیا اہل عرب اسے عام الفیل کہتے ہیں۔ اور اسی سال رسول اللہ ﷺ کی ولادتِ مبارکہ ہوئی۔ محدثین اور مورخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ واقعہ محرم میں پیش آیا تھا اور حضور ﷺ کی ولادت ربیع الاوّل میں ہوئی تھی۔ اکثریت یہ کہتی ہے کہ آپ ﷺ کی ولادت واقعہ فیل کے پچاس دن بعد ہوئی۔

جو تاریخی واقعات اوپر دیئے گئے ہیں ان کو نگاہ میں رکھ کر سورۂ فیل پر غور کیا جائے تو یہ بات آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ اس سورہ میں اس قدر اختصار کے ساتھ صرف اصحاب فیل پر اللہ تعالیٰ کے عذاب کا ذکر کر دینے پر کیوں اکتفا کیا گیا۔ واقعہ کچھ پرانا نہ تھا اور مکہ کا بچہ بچہ اس کو جانتا تھا۔ تمام اہل عرب اس بات کے قائل تھے کہ ابرہہ کے حملے سے کعبے کی حفاظت کسی دیوی دیوتا نے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے کی تھی۔ قریش کے سرداروں نے اللہ ہی سے مدد کے لیے دعائیں مانگی تھیں۔ پھر اس واقعہ سے وہ اس قدر متاثر رہے کہ کئی سالوں تک انہوں نے اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کی تھی۔ اس لیے سورۂ فیل میں تفصیلات کے ذکر کے بجائے صرف اس واقعہ کو یاد دلا دینا کافی تھا تاکہ قریش کے لوگ خصوصاً اور اہل عرب عموماً سوچیں کہ محمد ﷺ جس چیز کی طرف دعوت دے رہے ہیں وہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ دوسرے تمام معبودوں کو چھوڑ کر صرف اللہ وحدہٗ لاشریک کی عبادت کی جائے۔ (تفہیم القرآن۔ ج ۶۔ ص ۴۶۲ تا ۴۶۹ سے ماخوذ)۔

نوٹ:2

آیت۔ ۲۔ میں لفظ کید استعمال کیا گیا ہے جو کسی کو نقصان پہنچانے کے لیے خفیہ تدبیر کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہاں کیا چیز خفیہ تھی۔ ابرہہ ساٹھ ہزار کا لشکر ہاتھیوں کے دستے کے ساتھ لے کر اعلانیہ یمن سے مکہ آیا تھا اور اس نے یہ بات چھپا کر نہیں رکھی تھی کہ وہ کعبہ کو ڈھانے آیا ہے۔ اس لیے یہ تدبیر تو خفیہ نہ تھی۔ البتہ اس اعلانیہ کاروائی کے پیچھے جو نیت تھی وہ خفیہ تھی اور وہ حبشیوں کی یہ غرض تھی کہ وہ کعبہ کو ڈھا کر اور تمام اہل عرب کو مرعوب کر کے تجارت کا وہ راستہ عربوں سے چھین لینا چاہتے تھے جو جنوبِ عرب سے شام و مصر کی طرف جاتا تھا۔ اس مقصد کو انہوں نے چھپا کر رکھا تھا اور ظاہر یہ کیا تھا کہ ان کے کلیسا کی جو بے حرمتی عربوں نے کی ہے اس کا بدلہ وہ ان کا معبد ڈھا کر لینا چاہتے ہیں۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ:3

ابابیل کا لفظ جمع کا ہے مگر اس کا کوئی مفرد (واحد) مستعمل نہیں ہے۔ اس کے معنی پرندوں کے غول کے ہیں اور یہ کسی خاص پرندے کا نام نہیں ہے۔ اردو میں ایک خاص چڑیا کو ابابیل کہتے ہیں، یہاں وہ مراد نہیں ہے بلکہ یہ پرندے عجیب طرح کے تھے جو اس سے پہلے نہیں دیکھے گئے تھے۔ جسامت میں کبوتر سے چھوٹے تھے اور ان کے پنجے سرخ تھے۔ یہ کوئی ایسی جنس تھی جو پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی تھی اور نہ بعد میں دیکھی گئی۔ (معارف القرآن)۔

2050

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ (107)

آیت نمبر (1 تا 4)

ترکیب

(آیت۔1) اِیۡلٰفٌ باب افعال کا مصدر ہے۔ اس پر حروف جارہ کا لِ داخل ہوا جس نے اس کو جرّ دی ہے اور مضاف ہونے کی وجہ سے اس کی تنوین ختم ہوئی ہے۔ قُرَیۡشٍ اس کا مضاف الیہ ہے۔ بات کا مرکب جاری سے شروع ہونا تقاضا کرتا ہے کہ اس سے پہلے کچھ محذوف مانا جائے۔ چنانچہ مفسرین کے ایک گروہ نے پچھلی سورت کے ساتھ معنوی تعلق کی بنا پر یہاں اِنَّ اَهۡلَكۡنٰهُمۡ یا اِنَّا اَهۡلَكۡنَا اَصۡحٰبَ الۡفِيۡلِ کو محذوف مانا ہے۔ دوسرے گروہ نے اس کا تعلق اس جملہ سے مانا ہے جو آگے آ رہا ہے یعنی فَلۡيَعۡبُدُوۡا ہم پہلی رائے کو ترجیح دیں گے۔ (آیت۔2) اٖلٰفِهِمۡ میں اِیۡلَافِ کی جرّ بتا رہی ہے کہ پچھلے مرکب جاری لِاِیۡلٰفِ قُرَیۡشٍ کا بدل ہے اِیۡلَافٌ دو مفعول کا تقاضہ کرتا ہے۔ کس کو مانوس کیا اور کس چیز سے مانوس کیا۔ یہاں اِیۡلَافِ کا مفعول اول ھِمۡ کی ضمیر ہے اور رِحۡلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيۡفِ مفعول ثانی ہے۔

ترجمہ

لِاِيۡلٰفِ قُرَيۡشٍ ۙ﴿۱﴾	اٖلٰفِهِمۡ	رِحۡلَةَ	الشِّتَآءِ
(ہم نے ہلاک کیا اصحاب فیل کو) قریش کو مانوس کرنے کے واسطے	ان کو مانوس کرنا	سفر سے	سردی کے

وَالصَّيۡفِ ۚ﴿۲﴾	فَلۡيَعۡبُدُوۡا	رَبَّ هٰذَا الۡبَيۡتِ ۙ﴿۳﴾	الَّذِيۡۤ اَطۡعَمَهُمۡ
اور گرمی کے	تو چاہیے کہ یہ لوگ بندگی کریں	اس گھر کے مالک کی	وہ جس نے کھانے کو دیا ان کو

مِّنۡ جُوۡعٍ ۙ	وَّاٰمَنَهُمۡ	مِّنۡ خَوۡفٍ ﴿۴﴾
بھوک میں	اور جس نے امن دیا ان کو	خوف میں

نوٹ: 1

اس پر تو مفسرین کا اتفاق ہے کہ معنی اور مضمون کے اعتبار سے یہ سورت سورۂ فیل ہی سے متعلق ہے اور شاید اسی وجہ سے بعض مصاحف میں ان دونوں کو ایک ہی سورت کے طور پر لکھا گیا تھا اور ان کے درمیان بسم اللہ نہیں لکھی گئی تھی مگر حضرت عثمان ؓ نے جب تمام مصاحف قرآن کو جمع کر کے ایک نسخہ تیار فرمایا اور تمام صحابہ کرام ؓ کا اس پر اجماع ہوا، تو اس میں ان دونوں کو الگ الگ سورتوں کے طور پر لکھا گیا اور دونوں کے درمیان بسم اللہ لکھی گئی۔ (معارف القرآن)۔

نوٹ: 2

اس سورہ کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس تاریخی پس منظر کو نگاہ میں رکھا جائے جس سے اس سورہ کے مضمون اور سورۂ فیل کے مضمون کا گہرا تعلق ہے۔

قریش کا قبیلہ نبی ﷺ کے جدِ اعلیٰ قُصَیّ بن کلاب کے زمانے تک حجاز میں منتشر تھا۔ قُصَیّ نے ان کو مکہ میں جمع کیا اور بیت اللہ کا انتظام اس قبیلہ کے ہاتھ آ گیا۔ اس نے اطرافِ عرب سے آنے والے حاجیوں کی خدمت کا بہترین انتظام کیا۔ قُصَیّ کے بعد اس کے بیٹوں عبد مناف اور عبدالدّار کے درمیان یہ انتظامات تقسیم ہو گئے۔ عبد مناف کے چار بیٹے تھے۔ ان میں ہاشم، حضرت عبدالمطلب کے والد اور رسول اللہ ﷺ کے پردادا تھے۔ ہاشم کو سب سے پہلے یہ خیال آیا کہ اس بین الاقوامی تجارت میں حصہ لیا جائے جو شام و مصر اور بلادِ مشرق (یعنی ہندوستان، انڈونیشا وغیرہ) کے درمیان ہو رہی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ایران کی حکومت اس

تجارتی راستے پر قابض ہو چکی تھی جو شمالی علاقوں اور خلیج فارس کے راستے سے رومی سلطنت اور بلادِ مشرق کے درمیان ہوئی تھی۔ اس لیے جنوبی عرب سے بحر احمر کے ساحل کے ساتھ ساتھ جو تجارتی راستہ شام و مصر کی طرف جاتا تھا، اس کا کاروبار بہت چمک اٹھا تھا۔ دوسرے تجارتی قافلوں کی بہ نسبت قریش کو یہ سہولت حاصل تھی کہ راستے کے تمام قبائل بیت اللہ کے خادم ہونے کی حیثیت سے ان کا احترام کرتے تھے۔ ان کے قافلوں پر ڈاکے نہیں مارتے تھے اور نہ ان سے رہگذر کے وہ بھاری ٹیکس وصول کرتے جو دوسرے قافلوں سے وصول کیا جاتا تھا۔ ہاشم نے انہی تمام پہلوؤں کو دیکھ کر تجارت کی اسکیم بنائی اور اس میں اپنے باقی تین بھائیوں کو شامل کیا۔ یہ اسکیم کامیاب رہی اور ان کی تجارت تیزی سے ترقی کرنے لگی۔

اس تجارت کی وجہ سے قریش کے لوگوں کو شام۔ مصر۔ عراق۔ ایران۔ یمن اور حبش کے لوگوں سے تعلقات کے مواقع حاصل ہوئے۔ اور مختلف ملکوں کی ثقافت و تہذیب سے براہِ راست سابقہ پیش آنے کے باعث ان کی دانش و بینیش کا معیار اتنا بلند ہوتا چلا گیا کہ کوئی دوسرا قبیلہ ان کی ٹکر کا نہ رہا۔ ان بین الاقوامی تعلقات کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوا کہ عراق سے یہ لوگ وہ رسم الخط لے کر آئے جو بعد میں قرآن مجید لکھنے میں استعمال ہوا۔ عرب کے کسی دوسرے قبیلے میں اتنے پڑھے لکھے لوگ نہ تھے جتنے قریش میں تھے۔ یہ حالات تھے جب مکہ پر ابرہہ کی چڑھائی کا واقعہ پیش آیا۔ اگر وہ کامیاب ہو جاتا تو عرب میں قریش ہی کی نہیں خود کعبہ کی دھاک بھی ختم ہو جاتی۔ مکہ تک حبشیوں کی پیش قدمی کے بعد رومی سلطنت آگے بڑھ کر شام اور مکہ کے درمیان کا تجارتی راستہ بھی اپنے قبضہ میں لے لیتی اور قریش اس سے زیادہ خستہ حالی میں مبتلا ہو جاتے جس میں وہ قُصَیّ بن کلاب سے پہلے مبتلا تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے حبشیوں کی ساٹھ ہزار فوج کو رہا کر دیا اور مکہ سے یمن تک سارے راستے اس فوج کے لوگ گر گر کر مرتے گئے، تو کعبہ کے بیت اللہ ہونے پر تمام اہل عرب کا ایمان پہلے سے بدرجہ زیادہ مضبوط ہو گیا ساتھ ہی قریش کی دھاک بھی ملک بھر میں پہلے سے زیادہ قائم ہو گئی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے زمانے میں یہ حالات سب ہی کو معلوم تھے، اس لیے ان کے ذکر کی حاجت نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس سورہ کے چار مختصر فقروں میں قریش سے صرف اتنی بات کہنے پر اکتفا کیا گیا کہ جب تم مانتے ہو کہ یہ گھر بتوں کا نہیں بلکہ اللہ کا گھر ہے اور جب تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہیں اس گھر کی طفیل یہ امن عطا کیا، تمہاری تجارت کو یہ فروغ بخشا اور تمہیں فاقہ زدگی سے بچا کر یہ خوشحالی نصیب کی، تو تمہیں اسی کی عبادت کرنی چاہیے۔ (تفہیم القرآن، ج۶۔ ص ۴۷۴ تا ۴۷۶ سے ماخوذ)۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ الماعون (107)

آیت نمبر (1 تا 7)

ترجمہ

اَرَءَيۡتَ الَّذِىۡ	يُكَذِّبُ	بِالدِّيۡنِ ۝١	فَذٰلِكَ	الَّذِىۡ
کیا تو نے دیکھا اس کو جو	جھوٹ جانتا ہے	بدلے (کے دن) کو	تو وہ،	وہ ہے جو

يَدُعُّ الۡيَتِيۡمَ ۝٢	وَلَا يَحُضُّ	عَلٰى طَعَامِ الۡمِسۡكِيۡنِ ۝٣
دھکا دیتا ہے یتیم کو	اور وہ ترغیب نہیں دیتا (کسی کو)	مسکین کا کھانا (دینے) پر

فَوَيۡلٌ لِّلۡمُصَلِّيۡنَ ۙ﴿۴﴾	الَّذِيۡنَ هُمۡ	عَنۡ صَلَاتِهِمۡ	سَاهُوۡنَ ۙ﴿۵﴾
تو بربادی ہے نمازیوں کے لیے	یہ وہ لوگ ہیں جو	اپنی نماز سے	غافل ہونے والے ہیں

الَّذِيۡنَ هُمۡ	يُرَآءُوۡنَ ۙ﴿۶﴾	وَيَمۡنَعُوۡنَ	الۡمَاعُوۡنَ ﴿۷﴾
یہ وہ لوگ ہیں جو	ریاکاری کرتے ہیں	اور روکتے ہیں	گھریلو اشیاء کو (گردش سے)

نوٹ:1 اس سورہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ آخرت پر ایمان نہ لانا، انسان کے اندر کس قسم کے اخلاق پیدا کرتا ہے۔ آیات۔2 اور 3۔ میں ان کفار کی حالت بیان کی گئی ہے جو اعلانیہ آخرت کو جھٹلاتے ہیں۔ اور آخری چار آیتوں میں ان منافقین کا حال بیان کیا گیا ہے جو بظاہر مسلمان ہیں مگر دل میں آخرت اور اس کی جزا و سزا کا کوئی تصور نہیں رکھتے۔ مجموعی طور پر دو گروہوں کے طرز عمل کو بیان کرنے سے مقصود یہ حقیقت ذہن نشین کرانا ہے کہ انسان کے اندر ایک مستحکم اور پاکیزہ کردار عقیدۂ آخرت کے بغیر پیدا نہیں ہوسکتا۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ:2 آیت۔3۔ میں اگر اِطۡعَامِ الۡمِسۡكِيۡنِ کہا گیا ہوتا تو معنی یہ ہوتے کہ وہ مسکین کو کھانا کھلانے پر نہیں اکساتا۔ لیکن طَعَامِ الۡمِسۡكِيۡنِ کے معنی یہ ہیں کہ وہ مسکین کا کھانا اس کو دینے پر نہیں اکساتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو کھانا مسکین کو دیا جاتا ہے وہ دینے والے کا کھانا نہیں ہے بلکہ اسی مسکین کا کھانا ہے۔ یعنی دینے والا کوئی بخشش نہیں دے رہا ہے بلکہ مسکین کا حق ادا کر رہا ہے۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ:3 آیت۔4۔5۔ کے متعلق حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ خدا کا شکر ہے فِيۡ صَلَاتِهِمۡ سَاهُوۡنَ نہیں فرمایا بلکہ عَنۡ صَلَاتِهِمۡ سَاهُوۡنَ فرمایا ہے۔ ہم نماز میں بھولتے تو ضرور ہیں مگر نماز سے غافل نہیں ہیں۔ اس لیے ہمارا شمار منافقوں میں نہیں ہوگا۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے ان کے صاحبزادے مصعب بن سعد نے پوچھا کہ آپ نے اس آیت پر غور فرمایا کیا اس کا مطلب نماز چھوڑ دینا ہے یا اس سے مراد نماز پڑھتے ہوئے خیال کسی اور طرف چلا جانا ہے۔ خیال ہٹ جانے کی حالت ہم میں سے کس پر نہیں گزرتی۔ حضرت سعدؓ نے فرمایا کہ اس سے مراد نماز کے وقت کو ضائع کرنا اور اسے وقت ٹال کر پڑھنا ہے۔ (تفہیم القرآن)۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

سورۃ الکوثر (108)

آیت نمبر (1 تا 3)

ن ح ر

(ف) نَحۡرًا — گلے میں چوٹ لگانا۔ ذبح کرنا۔
اِنۡحَرۡ — فعل امر ہے۔ تو ذبح کر۔ قربانی کر۔ زیر مطالعہ آیت۔2۔

ب ت ر

(ن) بَتۡرًا — کاٹنا۔ اللہ کا کسی کو بے اولاد کرنا۔ کسی کی نسل کو کاٹنا۔
(س) بَتَرًا — کٹ جانا۔ بے اولاد ہونا۔ نسل کٹا ہونا۔

اَبْتَرُ اَفْعَلُ کا وزن ہے بے اولاد۔نسل کٹا۔جس کی موت کے بعد اس کا خلف یعنی نام لیوا کوئی نہ ہو، نہ اولاد ہو اور نہ رشتہ دار یا احباب میں کوئی نام لیوا ہو زیر مطالعہ آیت۔3۔(ایسا لگتا ہے کہ یہ لفظ افعال الوان وعیوب اور افعل تفضیل، دونوں کے مفاہیم کا جامع ہے۔ بے اولاد یا نسل کٹا ہونا، الوان وعیوب کا مفہوم ہے اور کوئی خلف نہ ہونا۔افعل وتفضیل کا مفہوم ہے)۔

ترجمہ

اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ	الْكَوْثَرَ ۝۱	فَصَلِّ لِرَبِّكَ
بیشک ہم نے عطا کی آپؐ کو	بے انتہا (خیر)	تو آپؐ نماز پڑھیں اپنے رب کے لیے

وَانْحَرْ ۝۲	اِنَّ شَانِئَكَ	هُوَ الْاَبْتَرُ ۝۳
اور آپؐ اونٹ قربان کریں	بیشک آپؐ سے بغض رکھنے والا	ہی بالکل بے نام ونشان ہے

نوٹ:1

کوثر کے معنی ہیں بہت زیادہ بھلائی اور بہتری۔ یہاں اس سے کیا چیز مراد ہے اس کے متعلق متعدد اقوال ہیں۔ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ اس لفظ کے تحت ہر قسم کی دینی ودنیوی اور حسی ومعنوی نعمتیں داخل ہیں جو آپ ﷺ کو اور آپ ﷺ کے طفیل اس اُمت کو ملنے والی تھیں۔ان میں سے ایک بہت بڑی نعمت وہ حوض کوثر ہے جس کے پانی سے آپ ﷺ اپنی اُمت کو محشر میں سیراب فرمائیں گے۔بعض روایات سے اس کا محشر میں ہونا اور اکثر سے جنت میں ہونا ثابت ہوتا ہے۔علماء نے اس کی تطبیق یوں کی ہے کہ اصل نہر جنت میں ہوگی اور اسی کا پانی میدان حشر میں کسی حوض میں جمع کر دیا جائے گا۔(ترجمہ شیخ الہندؒ)

یہ انتہائی سخت وقت ہوگا جبکہ ہر ایک اَلْعَطَش۔ اَلْعَطَش (پیاس پیاس) پکار رہا ہوگا۔اس وقت آپ ﷺ کی اُمت اس حوض پر حاضر ہوگی اور اس سے سیراب ہوگی لیکن کچھ لوگ محروم رہیں گے۔اس کے بارے میں حضور ﷺ نے بار بار اپنے زمانے کے لوگوں کو خبردار کیا کہ میرے بعد تم میں سے جو لوگ بھی میرے طریقے کو بدلیں گے ان کو اس حوض سے ہٹا دیا جائے گا۔میں کہوں گا یہ میرے اصحاب ہیں تو مجھ سے کہا جائے گا کہ آپ ﷺ کو نہیں معلوم کہ آپ کے بعد انہوں نے کیا کیا ہے۔پھر میں ان کو دفع کروں گا اور کہوں گا کہ دور ہو۔یہ مضمون بکثرت روایات میں بیان ہوا ہے۔(بخاری، مسلم، مسند احمد، ابن ماجہ وغیرہ)۔

اسی طرح حضور ﷺ نے اپنے دور کے بعد قیامت تک آنے والے مسلمانوں کو بھی خبردار کیا ہے کہ ان میں سے جو بھی میرے طریقے سے ہٹ کر چلیں گے اور اس میں رد وبدل کریں گے انہیں اس حوض سے ہٹا دیا جائے گا۔میں کہوں گا کہ اے رب یہ تو میرے ہیں، میری اُمت کے لوگ ہیں۔جواب ملے گا آپ کو نہیں معلوم کہ انہوں نے آپ ﷺ کے بعد کیا کیا تغیرات کیے اور الٹے ہی پھرتے چلے گئے۔پھر میں ان کو دفع کروں گا۔اور حوض پر نہ آنے دوں گا۔اس مضمون کی بہت سی روایات احادیث میں ہیں۔

(بخاری۔مسلم۔مسند احمد۔ابن ماجہ)(تفہیم القرآن۔ج۶،ص ۴۹۳ تا ۴۹۵ سے ماخوذ)

نوٹ:2

جب حضور ﷺ نبی بنائے گیے اور آپ ﷺ نے قریش کو اسلام کی دعوت دینی شروع کی کہ قریش کے لوگ کہنے لگے کہ محمد (ﷺ) اپنی قوم سے کٹ کر ایسے ہو گئے ہیں جیسے کوئی درخت اپنی جڑ سے کٹ گیا ہو اور کچھ مدت بعد سوکھ کر پیوند خاک ہو جائے۔رسول اللہ ﷺ کی اولاد نرینہ میں بڑے صاحب زادے قاسمؓ تھے اور چھوٹے حضرت عبداللہؓ تھے۔پہلے حضرت قاسمؓ کا انتقال ہوا پھر حضرت عبداللہؓ نے بھی وفات پائی۔اس پر عاص بن وائل نے کہا کہ محمد (ﷺ) ابتر ہیں۔ان کا کوئی بیٹا نہیں ہے جو ان کا قائم مقام بنے۔جب وہ مر جائیں گے تو ان کا نام دنیا سے مٹ جائے گا اور ان سے تمہارا پیچھا چھوٹ جائے گا۔ایسی ہی باتیں

ابوجہل، عقبہ بن ابی معیط وغیرہ سے بھی منقول ہیں۔ حضور ﷺ کا اپنا چچا، جس کا گھر بالکل آپ ﷺ کے گھر سے ملا ہوا تھا، دوڑتا ہوا مشرکین کے پاس گیا اور ان کو یہ خوشخبری دی کہ آج رات محمد ﷺ کی جڑ کٹ گئی۔ قریش اس لیے آپ ﷺ سے بگڑے تھے کہ آپ ﷺ صرف اللہ ہی کی بندگی کرتے تھے اور ان کے شرک کو آپ ﷺ نے اعلانیہ رد کر دیا تھا۔ اس کی وجہ سے پوری قوم میں جو مرتبہ اور مقام آپ ﷺ کو نبوت سے پہلے حاصل تھا وہ آپ ﷺ سے چھین لیا گیا تھا اور آپ ﷺ گویا برادری سے کاٹ کر پھینک دیئے گئے تھے۔ آپ ﷺ کے چند مٹھی بھر ساتھی سب بے یار و مددگار تھے۔ یہ تھے وہ انتہائی دل شکن حالات جن میں سورۂ کوثر حضور ﷺ پر نازل کی گئی۔ (تفہیم القرآن۔ ج۶، ص۴۸۹ تا ۴۹۰ سے ماخوذ)

اس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے نبی ﷺ ابتر آپ ﷺ نہیں ہیں بلکہ آپ ﷺ کے یہ دشمن ابتر ہیں۔ یہ قرآن کی اہم پیشینگوئیوں میں سے ایک پیشین گوئی تھی جو حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی۔ اس وقت کوئی تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ قریش کے یہ بڑے بڑے سردار کیسے ابتر ہو جائیں گے۔ لیکن چند سالوں میں حالات بالکل پلٹ گئے اور وہ بالکل بے نام نشان ہو گئے۔ آج لاکھوں انسان آپ ﷺ ہی سے نہیں بلکہ آپ ﷺ کے ساتھیوں کے خاندانوں سے اپنی نسبت کو باعث عزت و شرف سمجھتے ہیں۔ کوئی سید ہے، کوئی علوی ہے، کوئی عباسی، ہاشمی، صدیقی، فاروقی، عثمانی، زبیری ہے تو کوئی انصاری ہے۔ مگر نام کو بھی کوئی ابوجہلی یا ابولہبی نہیں پایا جاتا۔ تاریخ نے ثابت کر دیا کہ ابتر حضور ﷺ نہیں بلکہ آپ ﷺ کے دشمن ہی تھے اور ہیں۔ (تفہیم القرآن۔ ج۶۔ ص۴۹۷ سے ماخوذ)۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ الکفرون (109)

آیت نمبر (1 تا 7)

ترجمہ

قُلۡ یٰۤاَیُّهَا الۡکٰفِرُوۡنَ ۙ﴿۱﴾	لَاۤ اَعۡبُدُ	مَا	تَعۡبُدُوۡنَ ۙ﴿۲﴾	وَلَاۤ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ
آپ کہہ دیجیے اے کافرو	میں بندگی نہیں کرتا	اس کی جس کی	تم لوگ بندگی کرتے ہو	اور نہ تم لوگ بندگی کرنے والے ہو

مَاۤ	اَعۡبُدُ ۚ﴿۳﴾	وَلَاۤ اَنَا عَابِدٌ	مَّا عَبَدۡتُّمۡ ۙ﴿۴﴾	وَلَاۤ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ
اس کی جس کی	میں بندگی کرتا ہوں	اور نہ (ہی) میں بندگی کرنے والا ہوں	اس کی جس کی تم لوگوں نے بندگی کی	اور نہ تم لوگ بندگی کرنے والے ہو

مَاۤ اَعۡبُدُ ؕ﴿۵﴾	لَکُمۡ دِیۡنُکُمۡ	وَلِیَ دِیۡنِ ﴿۶﴾
اس کی جس کی میں بندگی کرتا ہوں	تمہارے لیے تمہارا دین ہے	اور میرے لیے میرا دین ہے

نوٹ: 1

مکہ معظّمہ میں ایک دور ایسا گزرا ہے جب نبی ﷺ کی دعوت اسلام کے خالف قریش کے معاشرے میں مخالفت کا طوفان تو برپا ہو چکا تھا، لیکن ابھی قریش کے سردار اس بات سے بالکل مایوس نہیں ہوئے تھے کہ حضور ﷺ کو کسی نہ کسی طرح مصالحت پر آمادہ کیا جا سکے گا۔ اس لیے وقتاً فوقتاً وہ آپ ﷺ کے پاس مصالحت کی مختلف تجویزیں لے لے کر آتے رہتے تھے تا کہ آپ ﷺ ان میں سے کسی کو مان لیں۔ اس سلسلہ میں متعدد روایات احادیث میں منقول ہوئی ہیں۔ ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ ایک ہی مجلس میں نہیں بلکہ مختلف اوقات میں مختلف مواقع پر کفارِ قریش نے اس قسم کی تجویزیں پیش کی تھیں۔ اور اس بات کی ضرورت تھی کہ ایک ہی دفعہ دوٹوک جواب دے کر

ان کی اس اُمید کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے کہ رسول اللہ ﷺ دین کے معاملہ میں کچھ دو اور کچھ لو کے طریقے پر ان سے کوئی مصالحت کر لیں گے۔

اس پس منظر کو نگاہ میں رکھ کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورہ مذہبی رواداری کی تلقین کے لیے نازل نہیں ہوئی تھی، جیسا کہ آج کل کے بعض لوگ خیال کرتے ہیں، بلکہ اس لیے نازل ہوئی تھی کہ کفار کے دین، ان کی پوجا پاٹ اور ان کے معبودوں سے قطعی براءت کا اعلان کر دیا جائے۔ اور انہیں بتا دیا جائے کہ دین کفر اور دین اسلام ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں۔ ان کے باہم مل جانے کا سرے سے کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ بات اگرچہ ابتداءً قریش نے کفار کو مخاطب کر کے ان کی تجاویز مصالحت کے جواب میں کہی گئی تھی لیکن اسے قرآن مجید میں درج کر کے تمام مسلمانوں کو قیامت تک کے لیے یہ تعلیم دے دی گئی ہے کہ دین کفر جہاں جس شکل میں بھی ہے مسلمانوں کو اس سے براءت کا اظہار کرنا چاہیے۔ (تفہیم القرآن۔ ج۶۔ ص ۵۰۰۔۵۰۱ سے ماخوذ)

نوٹ:2

آیت۔3۔ میں اور۔5۔ میں مَا اَعْبُدُ آیا ہے۔ عربی زبان میں ما کا لفظ عموماً بے جان یا بے عقل چیزوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اور ذی عقل ہستیوں کے لیے مَنْ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ اس بنا پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہاں مَنْ اَعْبُدُ کہنے کے بجائے مَا اَعْبُدُ کیوں کہا گیا۔ عام طور پر اس کے چار جواب مفسرین نے دیئے ہیں۔ یہ چاروں تاویلات اگرچہ ایک ایک لحاظ سے درست ہیں اور عربی زبان میں ان سب کی گنجائش ہے، لیکن ان میں سے کسی سے بھی وہ اصل مدعا واضح نہیں ہوتا جس کے لیے مَنْ اَعْبُدُ کہنے کے بجائے مَا اَعْبُدُ کہا گیا ہے۔

دراصل عربی زبان میں کسی شخص کے لیے جب مَنْ کا لفظ استعمال ہو تو اس سے مقصود اس کی ذات کے متعلق کچھ کہنا یا پوچھنا ہوتا ہے۔ اور جب مَا کا لفظ استعمال ہوتا ہے تو اس سے مقصود اس کی صفت کے بارے میں استغفار یا اظہار خیال ہوتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے اردو میں جب ہم کہتے ہیں یہ صاحب کون ہیں تو مقصد اس شخص کی ذات سے تعارف حاصل کرنا ہوتا ہے۔ مگر جب ہم کہتے ہیں یہ صاحب کیا ہیں۔ تو اس سے معلوم کرنا مقصود ہوتا ہے کہ وہ شخص کیا کرتا ہے یا اس کے پیشے میں اس کا مقام و منصب کیا ہے۔ مثلاً اگر وہ کسی درسگاہ سے تعلق رکھتا ہے تو کیا وہ لیکچرر ہے۔ پروفیسر ہے کس علم یا فن کا استاد ہے۔ کیا ڈگریاں رکھتا ہے وغیرہ۔ اگر آیت میں یہ کہا جاتا کہ لَا اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَنْ اَعْبُدُ تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ تم اس ہستی کی عبادت کرنے والے نہیں جس کی عبادت میں کرتا ہوں۔ اس کے جواب میں مشرکین یہ کہہ سکتے تھے کہ اللہ کی ہستی کو تو ہم مانتے ہیں اور ہم اس کی بھی عبادت کرتے ہیں۔ لیکن جب یہ کہا گیا کہ لَا اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ جن صفات کے معبود کی عبادت میں کرتا ہوں ان صفات کے معبود کی عبادت کرنے والے تم نہیں ہو اور یہی وہ اصل بات ہے جس کی بنا پر نبی ﷺ کا دین منکرین خدا (یعنی دہریوں) کے سوا تمام اقسام کے کفار کے دین سے قطعی طور پر الگ ہو جاتا ہے کیونکہ نبی ﷺ کا خدا ان سب کے خدا سے بالکل مختلف ہے۔ ان میں سے کسی کا خدا چھ دن میں دنیا پیدا کرنے کے بعد ساتویں دن آرام کرنے والا ہے۔ حضرت یعقوب سے کشتی لڑتا ہے اور عُزَیْر نامی ایک بیٹا رکھتا ہے۔ کسی کا خدا دوسرے کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے اپنے اکلوتے بیٹے کو صلیب پر چڑھا دیتا ہے۔ کسی کا خدا بیوی بچے رکھتا ہے مگر اس کے ہاں صرف بیٹیاں پیدا ہوتی ہیں۔ کسی کا خدا انسانی شکل میں روپ دھار کر زمین پر انسانوں کے لیے کام کرتا ہے وغیرہ۔ غرض خدا کو ماننے والے کفار بھی اس خدا کو نہیں مانتے جس کی صفات کی تعلیم قرآن دیتا ہے۔ ان صفات کے معبود کی عبادت محمد ﷺ اور ان کی پیروی کرنے والوں کے سوا دنیا میں کوئی بھی نہیں کر رہا ہے۔ (تفہیم القرآن۔ ج۶، ص ۵۰۵۔۵۰۶ سے ماخوذ)

نوٹ:3

اس سورہ میں کافروں کی طرف سے پیش کی ہوئی مصالحت کی مختلف صورتوں کو بالکل رد کر کے اعلان براءت کیا گیا۔ 2050 سورۃ الانفال کی آیت۔۶۱۔ میں یہ ہدایت دی گئی ہے کہ کفار اگر صلح کی طرف جھکیں تو آپ ﷺ بھی جھک جایئے یعنی صلح کر لیجئے اور مدینہ میں یہود سے آپ ﷺ کا معاہدۂ صلح مشہور و معروف ہے۔ اس ضمن میں صحیح بات یہ ہے کہ جس قسم کی مصالحت سے اس سورہ میں اعلان براءت کیا گیا وہ جیسے اُس وقت حرام تھی، آج بھی حرام ہے اور جس صورت کی اجازت سورۂ انفال میں آئی ہے اور میثاقِ مدینہ سے عملاً ظاہر ہوئی، وہ جیسے اس وقت جائز تھی آج بھی جائز ہے۔ بات صرف موقع و محل اور شرائط صلح کو دیکھنے اور سمجھنے کی ہے۔ اس کا فیصلہ خود رسول اللہ ﷺ نے ایک حدیث میں فرمایا ہے جس میں کفار سے معاہدہ کو جائز قرار دینے کے ساتھ ایک استثنا کا ارشاد ہے اِلاَّ صُلْحًا اَحَلَّ حَرَامًا اَوْ حَرَّمَ حَلَالًا۔ یعنی ہر صلح جائز ہے سوائے اس صلح کے جس کی رو سے اللہ کی حرام کی ہوئی کسی چیز کو حلال یا حلال کی ہوی چیز کو حرام قرار دیا گیا ہو۔ (معارف القرآن)۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ النصر (110)

آیت نمبر (1 تا 3)

ترجمہ

اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰہِ	وَالۡفَتۡحُ ۙ﴿۱﴾	وَرَاَیۡتَ النَّاسَ	یَدۡخُلُوۡنَ
جب آئے اللہ کی مدد	اور وہ فتح	اور آپ دیکھیں لوگوں کو	داخل ہوتے ہوئے

فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا ۙ﴿۲﴾	فَسَبِّحۡ	بِحَمۡدِ رَبِّکَ
اللہ کے دین میں گروہ در گروہ ہوتے ہوئے	تو آپ تسبیح کریں	اپنے رب کی حمد کے ساتھ

وَاسۡتَغۡفِرۡہُ ؕ	اِنَّہٗ کَانَ تَوَّابًا ﴿۳﴾ ع
اور آپ مغفرت مانگیں اس سے	بیشک وہ بہت توبہ قبول کرنے والا ہے

نوٹ:1

آیت۔2۔ کا مطلب یہ ہے کہ جب وہ زمانہ رخصت ہو جائے جب ایک ایک دو دو کر کے لوگ اسلام میں داخل ہوتے تھے اور وہ وقت آ جائے جب پورے پورے قبیلے از خود مسلمان ہونے لگیں۔ آیت۔3۔ کا مطلب ہے کہ اپنے رب کی قدرت کا یہ کرشمہ جب تم دیکھ لو تو اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو۔ اس میں حمد کا مطلب یہ ہے کہ اس عظیم کامیابی کے متعلق تمہارے دل میں کبھی یہ خیال نہ آئے کہ یہ تمہارے اپنے کمال کا نتیجہ ہے۔ بلکہ اس کو سراسر اللہ کا فضل و کرم سمجھو۔ اس پر اس کا شکر ادا کرو اور دل و زبان سے اس کا اعتراف کرو۔ تسبیح یعنی سبحان اللہ کہنے میں ایک پہلو تعجب کا بھی ہے۔ جب کوئی مُحیّر العقول واقعہ پیش آتا ہے تو آدمی سبحان اللہ کہتا ہے اور اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ ہی کی قدرت سے ایسا حیرت انگیز واقعہ رونما ہوا ہے ورنہ دنیا کی کسی طاقت کے بس میں یہ نہیں تھا۔

وَاسۡتَغۡفِرۡہُ کا مطلب ہے کہ اپنے رب سے دعا مانگو کہ جو خدمت اس نے تمہارے سپرد کی تھی اس کو انجام دینے میں جو بھول چوک کوتاہی ہوئی ہو، اس سے درگزر فرمائے۔ یہ ہے وہ ادب جو اسلام میں بندے کو سکھایا گیا ہے۔ کسی انسان سے اللہ کے دین کی کیسی بھی بڑی سے بڑی خدمت انجام پائی ہو اور اس کی عبادت و بندگی میں کتنی بھی محنت اس نے کی ہو، اس کے دل میں کبھی یہ خیال نہ آنا چاہیے کہ میں نے

اپنے رب کا حق ادا کر دیا۔ بلکہ اسے ہمیشہ یہی سمجھنا چاہیے کہ جو کچھ مجھے کرنا چاہیے تھا وہ میں نہیں کر سکا اور اسے دعا مانگنی چاہیے کہ مجھ سے جو بھی کوتاہی ہوئی ہے اس سے درگزر فرما کر میری حقیری خدمت قبول فرمائے۔ (تفہیم القران)۔ 2050

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اس سورت کے نازل ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ جب کوئی نماز پڑھتے تو یہ دعا کرتے تھے۔ حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ اس سورت کے نزول کے بعد اٹھتے بیٹھتے اور آتے جاتے ہر وقت یہ دعا پڑھتے تھے سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ وَاَتُوْبُ اِلَيْهِ (معارف القرآن)۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سورۃ اللہب (111)

آیت نمبر (1 تا 5)

ترکیب

آیت۔1) تَبَّتْ واحد مؤنث غائب کا صیغہ ہے۔ اسی کا فاعل یَدَآ اِبِیْ لَهَبٍ ہے۔ مضاف ہونے کی وجہ سے نون تثنیہ گرا ہوا ہے۔ تَبَّ واحد مذکر غائب ہے۔ اس کا فاعل اس میں شامل هُوَ کی ضمیر ہے۔ افعال ماضی میں خبر دینے کا مفہوم بھی ہوتا ہے اور دعا مانگنے کا بھی۔ (دیکھیں آیت۔2/البقرۃ 72، نوٹ۔2) اس آیت کے خبریہ اور دعائیہ، دونوں ترجمے درست مانے جائیں گے۔ ہم دعائیہ کو ترجیح دیں گے۔ (آیت۔2) مَآ اَغْنٰى مَا کو نافیہ بھی مانا جا سکتا ہے اور استفہامیہ بھی، دونوں ترجمے درست ہوں گے۔ ہم نافیہ کو ترجیح دیں گے۔ مَا كَسَبَ میں مَا موصولہ ہے آیت۔3) سَيَصْلٰى کا فاعل اس میں شامل هُوَ کی ضمیر ہے۔ (آیت۔4) وَامْرَاَتُهٗ کی رفع بتا رہی ہے کہ یہ سَيَصْلٰى کا فاعل ثانی ہے۔ اس کا حال ہونے کی وجہ سے حَمَّالَةَ حالتِ نصب میں ہے۔

ترجمہ

تَبَّتْ	يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ	وَّتَبَّ ؕ①	مَآ اَغْنٰى عَنْهُ	مَالُهٗ
تباہ ہوں	ابولہب کے دونوں ہاتھ	اور وہ (بھی) تباہ ہو	کام نہ آئے اس کے	اس کا مال

وَمَا	كَسَبَ ؕ②	سَيَصْلٰى نَارًا	ذَاتَ لَهَبٍ ۖ③
اور وہ جو	اس نے کمایا	وہ گرے گا ایک ایسی آگ میں جو	شعلے والی ہے

وَّامْرَاَتُهٗ ؕ	حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ۚ④
اور اس کی عورت (بھی)	بہت ہی اٹھانے (لیے پھرنے) والی ہوتے ہوئے لگا بجھائی کو

فِيْ جِيْدِهَا	حَبْلٌ	مِّنْ مَّسَدٍ ۚ⑤
اس کی گردن میں	ایک ایسی رسی ہے جو	کھجور کے ریشے سے (بٹی) ہے

نوٹ: 1

قرآن مجید میں یہ ایک ہی مقام ہے جہاں دشمنانِ اسلام میں سے کسی شخص کا نام لے کر اس کی مذمت کی گئی ہے حالانکہ مکہ میں بھی اور مدینہ میں بھی بہت سے لوگ ایسے تھے جو اسلام اور محمد ﷺ کی عداوت میں ابولہب سے کس طرح کم نہ تھے۔ سوال یہ

ہے کہ اس شخص کی وہ کیا خصوصیت تھی جس کی بنا پر اس کا نام لے کر اس کی مذمت کی گئی۔ وجہ یہ ہے کہ عربی معاشرے کی اخلاقی قدروں میں صلۂ رحمی کو بڑی اہمیت حاصل تھی اور قطعی رحمی کو بہت بڑا گناہ سمجھا جاتا تھا۔ عرب کی انہی روایات کا یہ اثر تھا کہ قریش کے دوسرے خاندانوں اور ان کے سرداروں نے تو حضور ﷺ کی شدید مخالفت کی مگر بنو ہاشم نے نہ صرف آپ ﷺ کی مخالفت نہیں کی بلکہ وہ آپ ﷺ کی حمایت کرتے رہے، حالانکہ ان میں سے اکثر لوگ ایمان نہیں لائے تھے۔ قریش کے دوسرے خاندان اس حمایت کو عرب کی روایات کے عین مطابق سمجھتے تھے۔ اس لیے انہوں نے کبھی بنو ہاشم کو یہ طعنہ نہیں دیا کہ تم اپنے آبائی دین سے منحرف ہو گئے ہو۔ اس اخلاقی اصول کو صرف ایک شخص نے توڑ ڈالا۔ اور وہ تھا ابولہب جو آپ ﷺ کا سگا چچا تھا۔ یہاں تک کہ نبوت کے ساتویں سال جب قریش نے بنو ہاشم کا معاشرتی اور معاشی مقاطعہ کیا اور بنو ہاشم کے تمام خاندانوں نے رسول اللہ ﷺ کی حمایت پر ثابت قدم رہتے ہوئے شعب ابی طالب میں محصور ہو گئے تو تنہا یہی ابولہب تھا جس نے اپنے خاندان کا ساتھ دینے کے بجائے قریش کا ساتھ دیا۔ (تفہیم القرآن۔ ج ۶، ص ۵۲۰ تا ۳۲۵ سے ماخوذ۔ اس کے باقی جرائم کی تفصیل ان ہی صفات میں دیکھی جاسکتی ہے)۔

نوٹ:2

جب رسول اللہ ﷺ پر آیت وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ نازل ہوئی تو آپ ﷺ نے کوہ صفا پر چڑھ کر قبیلہ قریش کے لوگوں کو آواز دی تو لوگ جمع ہو گئے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر میں تمہیں خبر دوں کہ دشمن صبح شام میں تم پر ٹوٹ پڑنے والا ہے تو کیا تم لوگ میری تصدیق کرو گے۔ سب نے یک زبان ہو کر کہا ہاں ضرور تصدیق کریں گے۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں تمہیں ڈراتا ہوں ایک عذاب شدید ہے۔ یہ سن کر ابولہب نے کہا تَبًّا لَكَ اَلِهٰذَا جَمَعْتَنَا۔ اس آیت۔ ۱۔ میں پہلا جملہ تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ بطور بددعا کے ہے یعنی ابولہب ہلاک ہو جائے۔ اور دوسرا جملہ وَ تَبَّ خبریہ ہے۔ گویا بددعا کے ساتھ اس کا اثر بھی بتا دیا کہ وہ ہلاک ہو گیا۔ بددعا کا جملہ مسلمانوں کے شفاء غیظ کے لیے ارشاد فرمایا گیا کیونکہ جب ابولہب نے آپ ﷺ کی شان میں تَبًّا کہا تو مسلمانوں کے دل کی خواہش تھی کہ وہ اس کے لیے بددعا کریں۔ حق تعالیٰ نے گویا ان کے دل کی بات خود فرما دی۔ (معارف القرآن)۔

یہاں کوئی ایسا قرینہ موجود نہیں ہے کہ ایک فعل کو دعائیہ اور دوسرے کو خبریہ مانا جائے۔ اس لیے منطقی تقاضا یہ ہے کہ تَبَّتْ، تَبَّ، اور مَآ اَغْنٰى تینوں افعال کو یا تو دعائیہ مانا جائے یا خبریہ۔ ہم نے دعائیہ کو ترجیح دی ہے کیونکہ یہ اس وقت کے اہل ایمان کے دل کی آواز تھی۔ اور جہاں تک دعا کے پورا ہونے کا مسئلہ ہے تو اس وقت بھی آج بھی ہر اہل ایمان کا ایمان ہے کہ اللہ کا فرمان اٹل ہے۔ اس لیے خبر دینے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ (مرتب)۔

نوٹ:3

كَسَبَ کے معنی ہیں کمانا۔ یعنی وقت، محنت اور اپنے وسائل خرچ کر کے کوئی چیز حاصل کرنا۔ ظاہر ہے اس میں وہ مال بھی آتا ہے جو انسان کماتا ہے، معاشرے میں وہ مقام و مرتبہ بھی جو وہ کوشش کر کے اپنے لیے بناتا ہے، وہ انصار و اعوان بھی جو وہ اپنے تعلقات کے ذریعہ بناتا ہے اور رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کے مطابق آدمی کا بیٹا بھی اس کا کسب ہے۔ یہاں آیت۔ ۲۔ میں مال کا ذکر پہلے آچکا ہے اس لیے وَمَا كَسَبَ میں مال کے علاوہ باقی دوسری کمائیاں مراد ہیں جس میں بیٹے بھی شامل ہیں۔ ابولہب کے انجام سے یہ سب معانی مناسبت رکھتے ہیں۔ کیونکہ بدر کی شکست کے سات روز بعد اس کو طاعون کی گلٹی نکلی جس کو عرب میں عَدَسَہ کہتے ہیں اور جو چھوت کی بیماری ہے۔ اس لیے سب گھر والوں نے اس کو الگ ڈال دیا اور اسی بے کسی کی حالت میں وہ مر گیا۔ تین روز تک لاش پڑی رہی۔ جب سڑنے لگا تو بیٹوں نے مزدوروں سے اٹھوا کر مٹی میں دبوا دیا۔ اس وقت مال، اولاد، تعلقات، کچھ بھی اس کے کام نہ آیا۔

2050

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ الاخلاص(112)

آیت نمبر(1تا4)

ص م د

(ن۔ض) صَمَدًا حاجت روائی کے لیے کسی کا قصد کرنا۔رجوع کرنا۔

صَمَدٌ ایسی ہستی جس کی طرف حاجت روائی کے لیے رجوع کیا جائے اور جس کو کسی سے بھی رجوع کرنے کی ضرورت نہ ہو، بے نیاز۔﴿ اَللّٰہُ الصَّمَدُ ۚ﴾ (112/الاخلاص:2)''اللہ قطعی بے نیاز ہے۔''

ک ف ء

(ف) کَفْأً لوٹنا۔اعتدال سے متجاوز ہونا۔

(مفاعلہ) مُکَافَئَۃً برابری کرنا۔ہم پلہ ہونے کی کوشش کرنا۔

کُفُوًا برابری والا۔ہم پلہ۔مماثل۔آیت۔112/البقرۃ:4۔

ترکیب

(آیت۔1)اس کی مختلف ترکیبیں کی گئی ہیں۔ہماری ترجیح یہ ہے کہ ھُوَضمیر الشان ہے۔اَللّٰہُ مبتدااور اَحَدٌ اس کی خبر ہے۔(آیت۔2) اَللّٰہُ مبتدااور اَلصَّمَدُ اس کی خبرمعرفہ ہے۔اس پر جو الف لام ہے اس کو اگر لام تعریف مانیں تو بین السطور مطلب یہ ہوگا کہ متعدد ہستیاں صمد ہیں اور یہاں کسی مخصوص صمد کی بات ہورہی ہے یہ بات خلاف واقعہ ہے۔اس سے معلوم ہوا کہ اس پر لام جنس ہے۔(آیت۔4)لَمْ یَکُنْ کا اسم اَحَدٌ ہے اس لیے یہ حالت رفع میں ہے۔اوریَکُنْ کی خبر ہونے کی وجہ سے کُفُوًا حالت نصب میں ہے۔سادہ جملہ یوں ہوسکتا ہے وَلَمْ یَکُنْ اَحَدٌ کُفُوًا لَّہٗ۔

ترجمہ

قُلْ	ھُوَ	اللّٰہُ اَحَدٌ ۚ ①	اَللّٰہُ الصَّمَدُ ۚ ②	لَمْ یَلِدْ ۙ
آپ ؐ کہیے	حقیقت بس یہ ہے کہ	اللہ یکتا ہے	اللہ ہی قطعی بے نیاز ہے	اس نے جنا ہی نہیں

وَلَمْ یُوْلَدْ ۙ ③	وَلَمْ یَکُنْ	لَّہٗ کُفُوًا	اَحَدٌ ④
اور نہ ہی وہ جنا گیا	اور ہوا ہی نہیں	اس کا مماثل (اس کے جیسا)	کوئی ایک بھی

نوٹ:1

قرآن مجید کی دوسری سورتوں میں بالعموم کسی ایسے لفظ کو ان کا نام قرار دیا گیا ہے جو ان میں وارد ہوا ہو۔لیکن اس سورہ میں لفظ اخلاص کہیں وارد نہیں ہوا۔اس کو یہ نام اس کے معنی کے لحاظ سے دیا گیا ہے جو شخص بھی اس کو سمجھ کر اس کی تعلیم پر ایمان لے آئے گا وہ شرک سے خلاصی پا جائے گا۔جب رسول اللہ ﷺ توحید کی دعوت لے کر اٹھے تھے اس وقت دنیا کے مذہبی تصورات کیا تھے۔(اس کا ایک ہلکا سا جائزہ سورۃ کافرون کے نوٹ۔2۔کے آخر میں دیا ہوا ہے۔مرتب)اس حالت میں جب اللہ وحدہٗ لاشریک کو ماننے کی دعوت دی گئی تو لوگوں کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہونا لازمی تھا کہ وہ رب آخر کس قسم کا ہے کہ تمام معبودوں کو چھوڑ کر تنہا ایک ہی رب اور معبود ماننے کی دعوت دی جارہی ہے۔ قرآن مجید کا یہ اعجاز ہے کہ اس نے ان سوالات کا جواب چند الفاظ میں دے کر اللہ کی ہستی کا ایسا واضح

تصور پیش کر دیا جو تمام مشرکانہ تصورات کا قلع قمع کر دیتا ہے اور اس کی ذات کے ساتھ مخلوقات کی صفات میں سے کسی صفت کی آلودگی کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رہنے دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی نگاہ میں اس سورت کی بڑی عظمت تھی اور آپ ﷺ مسلمانوں کو اس کی اہمیت محسوس کراتے تھے تاکہ وہ کثرت سے اس کو پڑھیں اور لوگوں میں اسے پھیلائیں۔ احادیث میں کثرت سے یہ روایات بیان ہوئی ہیں کہ آپ ﷺ نے لوگوں کو بتایا کہ یہ سورت ایک تہائی قرآن کے برابر ہے۔ مفسرین نے اس ارشاد کی بہت سی توجیہات بیان کی ہیں۔ ہمارے نزدیک سیدھی بات یہ ہے کہ قرآن جس دین کو پیش کرتا ہے اس کی بنیاد تین عقیدے ہیں۔ توحید، رسالت اور آخرت۔ یہ سورہ چونکہ خالص توحید کو بیان کرتی ہے اس لیے رسول اللہ ﷺ نے اس کو ایک تہائی قرآن کے برابر قرار دیا۔ (تفہیم القرآن۔ ج6۔ص530 تا533 سے ماخوذ)

نوٹ:2 ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ مجھے اس سورہ سے بڑی محبت ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کی محبت نے تمہیں جنت میں داخل کر دیا۔ ایک طویل حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص صبح اور شام قل ھو اللہ احد اور مُعَوِّذَتَیْنِ (یعنی سورہ فلق اور سورہ الناس) پڑھ لیا کرے تو یہ اس کو ہر بلا سے بچانے کے لیے کافی ہے۔ ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں تم کو ایسی تین سورتیں بتاتا ہوں کہ جو تورات، انجیل، زبور اور قرآن، سب میں نازل ہوئی ہیں۔ اور فرمایا کہ رات کو اس وقت تک مت سوؤ جب تک ان تین کو نہ پڑھ لو۔ (یعنی مُعَوِّذَتَیْنِ اور قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ) (معارف القرآن)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سورۃ الفلق (113)

آیت نمبر (1 تا5)

و ق ب

(ض) **وَقْبًا** آنا۔ جیسے چاند کا گہن میں آنا۔ تاریکی پھیلنا۔ آیت۔ 113 / الفلق:3۔

ن ف ث

(ن۔ض) **نَفْثًا** منہ سے تھوڑا سا تھوک نکالنا یا تھوتھو کرنا۔ جادو کے گنڈوں پر پھونک مارنا۔

نَفَّاثٌ مؤنث نَفَّاثَۃٌ۔ فَعَّالٌ کے وزن پر مبالغہ ہے۔ بار بار یا کثرت سے پھونک مارنے والا۔ آیت۔ 113 / الفلق:4۔

ترجمہ

قُلْ اَعُوْذُ	بِرَبِّ الْفَلَقِ ۙ﴿۱﴾	مِنْ شَرِّ مَا	خَلَقَ ۙ﴿۲﴾
آپؐ کہیے میں پناہ میں آتا ہوں	صبح کے مالک کی	اس کے شر سے جو	اس نے پیدا کیا

وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ	اِذَا وَقَبَ ۙ﴿۳﴾	وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ
اور اندھیرا کرنے والے (یعنی رات) کے شر سے	جب وہ چھا جائے	اور پھونک مارنے والیوں کے شر سے

فِي الْعُقَدِ ۝٤	وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ	اِذَا حَسَدَ ۝٥ ع 2050
گرہوں میں	اور حسد کرنے والے کے شر سے	جب وہ حسد کرے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سورۃ الناس (114)

آیت نمبر (1 تا 6)

ترکیب

اَلْوَسْوَاسِ اور اَلْخَنَّاسِ دونوں اسم المبالغہ ہیں جو ایک طرح سے اسم الصفہ ہوتے ہیں۔ (دیکھیں آسان عربی گرامر، حصہ سوم پیراگراف 60:1)۔ اس لیے اَلْخَنَّاسِ کو مضاف الیہ اَلْوَسْوَاسِ کی صفت ماننے کی گنجائش نہیں ہے اور اَلْخَنَّاسِ کو شَرِّ کا مضاف الیہ ثانی مانا جائے گا۔ اَلْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ کا موصوف یہاں محذوف ہے۔ آگے آیات۔4۔5۔ میں اسی محذوف موصوف کی وضاحت ہے۔

ترجمہ

قُلْ اَعُوْذُ	بِرَبِّ النَّاسِ ۝١	مَلِكِ النَّاسِ ۝٢
آپؐ کہیے میں پناہ میں آتا ہوں	انسانوں کے پروردگار کی	انسانوں کے بادشاہ کی

اِلٰهِ النَّاسِ ۝٣	مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۙ الْخَنَّاسِ ۝٤
انسانوں کے حاجت روا، مشکل کشا، پناہ دہندہ کی	بار بار وسوسہ اندازی کرنے والے بار بار دبک جانے والے کے شر سے

الَّذِيْ يُوَسْوِسُ	فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۝٥	مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ۝٦ ع
وہ جو وسوسہ اندازی کرتا ہے	انسانوں کے دلوں میں	جو جنوں اور انسانوں میں سے ہوتا ہے

نوٹ: 1

سورہ فلق اور سورۂ ناس، یہ دونوں سورتیں ایک ساتھ، ایک ہی واقعہ میں نازل ہوئیں۔ ابن قیمؒ نے ان دونوں سورتوں کی تفسیر یکجا لکھی ہے۔ اس میں فرمایا کہ ان دونوں سورتوں کے منافع اور برکات سے سب لوگوں کی ضرورت ایسی ہے کہ کوئی انسان ان سے مستغنی نہیں ہوسکتا۔ ان کو سحر، نظر بد اور تمام جسمانی اور روحانی آفات دور کرنے میں تاثیر عظیم حاصل ہے۔ اس کا واقعہ اس طرح ہے کہ نبی کریم ﷺ پر ایک یہودی نے جادو کر دیا تھا جس کے اثر سے آپ ﷺ بیمار ہو گئے تھے۔ جبرئیلؑ نے آکر آپ ﷺ کو اطلاع دی کہ آپ ﷺ پر ایک یہودی نے جادو کیا ہے اور جس چیز پر عمل کیا گیا ہے وہ فلاں کنویں میں ہے۔ آپ ﷺ نے وہاں آدمی بھیجے جو وہ چیز کنویں میں سے نکال لائے۔ اس میں گرہیں لگی ہوئی تھیں۔ آپ ﷺ نے ان گرہوں کو کھول دیا اور آپ ﷺ تندرست ہو گئے۔ جبرئیلؑ نے آپ ﷺ کو اس یہودی کا نام بتا دیا تھا اور آپ ﷺ اس کو جانتے تھے۔ مگر اپنے نفس کے معاملہ میں کسی سے انتقام لیں آپ ﷺ کی عادت نہیں تھی، اس لیے آپ ﷺ نے اس یہودی سے عمر بھر کچھ نہ کہا۔ (معارف القرآن)۔

نوٹ: 2

جو لوگ سحر (جادو) کی حقیقت سے ناواقف ہیں ان کو تعجب ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر جادو کا اثر کیسے ہوسکتا ہے۔ سحر کی حقیقت اور اس کے اقسام و احکام پوری تفصیل کے ساتھ سورۂ بقرہ کی تفسیر میں جلد اول صفحہ 217 تا 223 میں بیان کیے جا چکے ہیں،

وہاں دیکھ لیے جائیں۔ یہاں اس کا جو خلاصہ جاننا ضروری ہے وہ اتنا ہے کہ سحر کا اثر بھی طبعی اسباب کا اثر ہوتا ہے۔ جیسے آگ سے جلنا یا گرم ہونا، پانی سے سرد ہونا، کسی سبب سے بخار آجانا یا کسی مرض کا پیدا ہو جانا وغیرہ۔ یہ سب امر طبعی ہیں جن سے انبیاء مستثنیٰ نہیں ہوتے۔ اسی طرح جادو کا اثر بھی اسی قسم سے ہے اس لیے بعید نہیں۔ (معارف القرآن)

اس جادو کے واقعہ میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے ہے جو آپ ﷺ کے منصب نبوت میں قادح (عیب لگانے والی) ہو۔ ذاتی حیثیت سے اگر آپ ﷺ کو زخمی کیا جا سکتا ہے، اگر آپ ﷺ کو گھوڑے سے گر کو چوٹ لگ سکتی ہے، اگر آپ ﷺ کو بچھو کاٹ سکتا ہے، اور ان میں سے کوئی چیز بھی اس تحفظ کے منافی نہیں ہے جس کا نبوی ہونے کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ سے وعدہ کیا تھا، تو آپ ﷺ اپنی ذاتی حیثیت میں جادو کے اثر سے بیمار بھی ہو سکتے تھے۔ نبی۔ پر جادو کا اثر ہونا تو قرآن مجید سے بھی ثابت ہے۔ سورۂ طٰہٰ میں ہے کہ فرعون کے جادوگروں نے جو لاٹھیاں اور رسیاں پھینکی تھیں ان کے متعلق عام لوگوں نے ہی نہیں بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی یہی سمجھا کہ وہ ان کی طرف سانپوں کی طرح دوڑی چلی آرہی ہیں۔ اور اس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام خوفزدہ ہو گئے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر وحی نازل کی کہ خوف نہ کرو، تم ہی غالب رہو گے۔ اب رہا یہ اعتراض کہ اس طرح تو کفار مکہ کے اس الزام کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ نبی ﷺ کو وہ سحر زدہ آدمی کہتے تھے۔ لیکن یہ اعتراض درست نہیں ہے کیونکہ کفار آپ ﷺ کو سحر زدہ آدمی اس معنی میں نہیں کہتے تھے کہ آپ ﷺ جادو کے اثر سے بیمار ہو گئے ہیں، بلکہ اس معنی میں کہتے تھے کہ کسی جادوگر نے معاذ اللہ آپ کو پاگل کر دیا ہے اور اسی پاگل پن میں آپ نبوت کا دعویٰ کر بیٹھے ہیں۔ اب یہ بات بالکل واضح ہے کہ کفار کا یہ الزام ایسے واقعہ پر سرے سے چسپا ہی نہیں ہوتا جس کے متعلق تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ جادو کا اثر صرف ذاتِ محمد (ﷺ) پر ہوا تھا، نبوت محمد (ﷺ) اس سے بالکل غیر متاثر رہی۔ (تفہیم القرآن، ج۶، ص۵۵۵۔۵۵۶)

نوٹ: 3

ان سورتوں کے معاملہ میں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا جھاڑ پھونک کی اسلام میں کوئی گنجائش ہے اور یہ کہ جھاڑ پھونک مؤثر بھی ہے یا نہیں؟ یہ سوال اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ بکثرت احادیث میں یہ ذکر آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہر رات کو سوتے وقت موذتین (یعنی سورۂ فلق اور سورۂ ناس) یا بعض روایت کے مطابق معوذات (یعنی سورۂ اخلاص اور معوذتین) تین مرتبہ پڑھ کر اپنے دونوں ہاتھوں پر پھونکتے اور پورے جسم پر ہاتھ پھیر لیتے۔

اس معاملہ میں شرعی مسئلہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے ایک طویل حدیث کے آخر میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میری امت کے وہ لوگ بلا حساب جنت میں داخل ہوں گے جو نہ داغنے کا علاج کراتے ہیں نہ جھاڑ پھونک کراتے ہیں، نہ فال لیتے ہیں بلکہ اپنے رب پر توکل کرتے ہیں۔ ایک دوسری حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے داغنے سے علاج کرایا اور جھاڑ پھونک کرائی، وہ اللہ پر توکل سے بے تعلق ہو گیا۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ دس چیزوں کو ناپسند فرماتے تھے جن میں سے ایک جھاڑ پھونک بھی ہے سوائے معوذتین یا معوذات کے۔ بعض احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ابتداء میں حضور ﷺ نے جھاڑ پھونک سے بالکل منع فرما دیا تھا پھر بعد میں اس شرط کے ساتھ اس کی اجازت دے دی کہ اس میں شرک نہ ہو، اللہ کے پاک ناموں یا اس کے کلام سے جھاڑا جائے۔ کلام ایسا ہو جو سمجھ میں آئے اور یہ معلوم کیا جا سکے کہ اس میں کوئی گناہ کی چیز نہیں ہے۔ بھروسہ جھاڑ پھونک پر نہ کیا جائے کہ وہ شفا دینے والی ہے بلکہ اللہ پر بھروسہ کیا جائے کہ وہ چاہے گا تو اسے نافع بنا دے گا۔

2050

ایک مرتبہ نبی ﷺ بیمار ہوئے تو جبرئیلؑ نے آکر پوچھا کہ کیا آپ ﷺ بیمار ہو گئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں۔ جبرئیلؑ نے کہا:

بِسْمِ اللّٰهِ اَرْقِيْكَ	مِنْ كُلِّ شَيْءٍ	يُّؤْذِيْكَ	مِنْ شَرِّ كُلِّ نَفْسٍ
اللہ کے نام سے میں جھاڑتا ہوں آپ کو	تمام ایسی چیز سے جو	اذیت دے آپ کو	ہر ایک نفس کے شر سے

اَوْ عَيْنِ حَاسِدٍ	اَللّٰهُ يَشْفِيْكَ	بِسْمِ اللّٰهِ اَرْقِيْكَ
یا حسد کرنے والے کی آنکھ (کے شر) سے	اللہ شفا دے آپ کو	اللہ کے نام سے میں جھاڑتا ہوں آپ کو

اس کے علاوہ متعدد احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ نے زہریلے جانوروں کے کاٹے، ذباب کے مرض اور نظر بد کے جھاڑنے کی اجازت دی۔ جبکہ دوا سے علاج کرنے کی آپ ﷺ نے تاکید کی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ نے ہر مرض کی دوا پیدا کی ہے اور تم لوگ دوا کیا کرو۔ آپ ﷺ نے خود بھی لوگوں کو بعض امراض کے علاج بتائے جیسا کہ احادیث میں باب الطب کو دیکھنے سے معلوم ہو سکا ہے۔ لیکن دوا بھی اللہ ہی کے حکم اور اذن سے نافع ہوتی ہے۔ اب اگر دوا سے علاج کرنے کے ساتھ اللہ کے کلام اور اس کے اسماء حسنیٰ سے بھی استفادہ کیا جائے تو یہ بات مادہ پرستوں کے سوا کسی کی عقل کے بھی خلاف نہیں ہے۔ البتہ یہ صحیح نہیں ہے۔ کہ دوا سے علاج کو چھوڑ دیا جائے اور صرف جھاڑ پھونک سے ہی کام لینے پر اکتفا کیا جائے۔ (تفہیم القرآن۔ ج ۶۔ ص: ۵۷۷ تا ۵۶۰ سے ماخوذ)

نوٹ: 4

سورۂ فلق کی آیت۔ ۲۔ میں یہ بات قابل غور ہے کہ شر کو پیدا کرنے کی نسبت اللہ کی طرف نہیں کی گئی بلکہ مخلوقات کی پیدائش کی نسبت اللہ کی طرف اور شر کی نسبت مخلوقات کی طرف کی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے کسی مخلوق کو شر کے لیے نہیں پیدا کیا ہے۔ اس کا ہر کام خیر اور کسی مصلحت ہی کے لیے ہوتا ہے۔ البتہ مخلوقات کے اندر جو اوصاف اس نے اس لیے پیدا کیے ہیں کہ ان کی تخلیق کی مصلحت پوری ہو، ان سے بعض اوقات اور بعض اقسام کی مخلوقات سے اکثر شر رونما ہوتا ہے۔

نوٹ: 5

قرآن مجید کے آغاز اور اس کے اختتام میں جو مناسبت ہے وہ بھی ذہن میں واضح ہونی چاہیے۔ قران کریم کو حق تعالیٰ نے سورۂ فاتحہ سے شروع فرمایا ہے جس کا خلاصہ حق تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد اس کی مدد حاصل کرنا اور اس سے صراطِ مستقیم کی توفیق مانگنا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی مدد اور صراطِ مستقیم یہی دو چیزیں ہیں جن میں انسان کی دنیا و دین کے سب مقاصد کی کامیابی مضمر ہے۔ لیکن ان دونوں چیزوں کے حصول میں اور حصول کے بعد ان کے استعمال میں ہر قدم پر شیاطین جن و انس کے مکر و فریب اور وسوسوں کا جال بچھا رہتا ہے۔ اس لیے اس جال کو پاش پاش کرنے کی موثر تدابیر استعاذہ پر قرآن کو ختم کیا گیا۔ (معارف القرآن)۔

دُعَاءُ خَتْمِ الْقُرْاٰنِ

اَللّٰهُمَّ اٰنِسْ	وَحْشَتَنَا	فِيْ قُبُوْرِنَا	اَللّٰهُمَّ ارْحَمْنَا	بِالْقُرْاٰنِ الْعَظِيْمِ
اے اللہ تو مانوس کر دے	ہماری وحشت کو	ہماری قبروں میں	اے اللہ تو رحم کر ہم پر	اس عظیم قرآن (کی برکت) کے سبب سے

وَاجْعَلْهُ لَنَا	اِمَامًا وَّنُوْرًا	وَّهُدًا وَّرَحْمَةً	اَللّٰهُمَّ ذَكِّرْنَا
اور تو بنا دے اس کو ہمارے لیے	پیشوا اور روشنی	اور رہنمائی اور رحمت (کا ذریعہ)	اے اللہ تو یاد دلا دے ہم کو

مِنْهُمَا	نَسِيْنَا	وَعَلِّمْنَا	مِنْهُ مَا	جَهِلْنَا
اس میں سے وہ جو	ہم بھول جائیں	اور تو علم دے ہم کو	اس میں سے اس کا جس سے	ہم ناواقف رہیں

وَارْزُقْنَا	تِلَاوَتَهٗ	اٰنَاءَ الَّيْلِ	وَاٰنَاءَ النَّهَارِ
اور تو عطا کر ہم کو	اس کی تلاوت (کی توفیق)	رات کے وقتوں میں	اور دن کے وقتوں میں

وَاجْعَلْهُ لَنَا	حُجَّةً	يَا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ
اور تو بنادے اس کو ہمارے لیے	ایک حجت	اے تمام جہانوں کے پالنہار

وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ	اَوَّلًا وَّ اٰخِرًا	وَّ ظَاهِرًا وَبَاطِنًا	رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا
اور اللہ ہی کے لیے تمام شکر وسپاس ہے	اوّل وآخر میں	اور ظاہر وباطن میں	اے ہمارے رب تو مواخذہ نہ کرنا ہمارا

اِنْ نَّسِيْنَا	اَوْ اَخْطَاْنَا	رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا	اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ
اگر ہم بھول گئے (کچھ)	یا ہم چوک گئے (کہیں)	اے ہمارے رب تو قبول کرلے ہم سے (یہ ختم قرآن)	بیشک تو ہی سننے والا جاننے والا ہے۔

السلام وعلیکم رحمۃ اللہ وبرکاۃ

اللہ تعالیٰ ہم سب کی یہ سعی قبول فرمائے اور آخرت میں نجات کا ذریعہ بنائے۔ جس جس نے بھی اس کار خیر میں مال، جان اور صلاحیتوں کو لگایا اللہ قبول ومنظور فرمائے

انجمن خدام القرآن فیصل آباد میں اس کے فوٹو کاپی بھی دستیاب ہیں اور محترم ڈاکٹر جہاں زیب صاحب

کے اس کتاب میں اضافہ جات کے ساتھ مطالعہ قرآن حکیم کے نام سے دستیاب ہیں

رابطہ کے لئے:www.khuddam-ul-quran.cominfo@khuddam-ul-quran.com,

0412437781,0412437618,03217805614

قرآن اکیڈمی سعید کالونی نمبر 2 کینال روڈ فیصل آباد

2050

2050

2050

2050

2050

2050

2050

2050

2050

2050

2050

2050

انڈیکس برائے لغت (حصہ دوم)

4

ب

مادہ	آیت نمبر
ء	
ء ب ب	80/عبس:31
ع ص د	90/البلد:20
ب	
ب ت ر	108/الکوثر:3
ب ت ل	73/مزمل:8
ب س ر	74/مدثر:22
ب ع ث ر	82/الانفطار:4
ث	
ث ج ج	78/النبا:14
ج	
ج م م	89/الفجر:19
ح	
ح ر د	68/القلم:25
ح ر س	74/المدثر:8
ح ر ك	75/القیامۃ:16
ح ر ی	72/:14
ح س م	69/الحاقۃ:7
ح ص ل	100/العدیات:10
ح ض ض	69/الحاقۃ:34
ح ط ب	72/الجن:15
خ	
خ ن س	81/التکویر:15
د	
د ث ر	74/المدثر:1
د ح ی	79/النزیات:30

مادہ	آیت نمبر
د ح ق	78/النبا:34
ر	
ر ی ن	83/المطففین:14
ز	
ز ب ن	96/العلق:18
ز م ل	73/المزمل:1
س	
س ج و	93/الضحیٰ:2
س ط ہ	88/الغاشیۃ:20
س غ ب	90/البلد:14
س ف ع	96/العلق:15
س م ك	79/النزیات:28
س ھ ر	79/النزیات:14
ش	
ش ف ھ	90/البلد:9
ش م خ	77/المرسلت:27
ص	
ص خ خ	80/عبس:33
ص ر ع	69/الحاقۃ:7
ص ر م	68/القلم:17
ص م د	112/الاخلاص:2
ض	
ض ب ح	100/العدیات:1

مادہ	آیت نمبر
ض ن ن	81/التکویر:24
ط	
ط ب ق	67/الملک:3
ط خ ی	91/الشمس:6
ط ف ف	83/المطففین:1
ط م م	79/النزیات:34
ع	
ع ب س	74/المدثر:22
ع ز و	70/المعارج:37
ع ھ ن	70/المعارج:9
غ	
غ د ق	72/الجن:16
غ ص ص	73/مزمل:13
غ ط ش	79/النزیات:29
ق	
ق د ح	100/العدیات:2
ق ر ع	13/الرعد:31
ق ض ب	80/عبس:28
ق ط ف	69/الحاقۃ:31
ک	
ک ب د	90/البلد:4

مادہ	آیت نمبر
ک ش ب	73/مزمل:14
ک د ح	84/الانشقاق:6
ک د ر	81/التکویر:2
ک ش ط	81/التکویر:11
ک ف ت	77/المرسلات:25
ک ن د	100/العدیات:6
ک ن س	81/التکویر:16

ل

ل ب د	72/الجن:19
ل ظ ی	70/المعارج:15
ل ھ ب	77/المرسلات:31
ل ھ م	91/الشّمس:8

م

م ز ج	76/الدھر:5
م ش ج	76/الدھر:2
م ط ی	75/القیامۃ:33

ن

ن ج د	90/البلد:10
ن ح ر	108/التکویر:2
ن خ ر	79/النزیات:11
ن ط ش	79/النزیات:2
ن ض ر	75/القیامۃ:22
ن ف ث	113/الفلق:4

مادہ	آیت نمبر
ن ق ع	100/العدیات:4

و

و ء د	81/التکویر:8
و ت ن	69/الحاقۃ:46
و ح ش	81/التکویر:5
و س ق	84/الانشقاق:17
و ف ض	70/المعارج:43
و ق ب	113/الفلق:3
و ھ ج	78/النبا:13
و ھ ی	69/الحاقۃ:17

ھ

ھ ر ب	72/الجن:12
ھ ز ل	86/الطارق:14
ھ ل ع	70/المعارج:19
ھ ی ل	73/المزمل:14

مادہ	آیت نمبر

انڈیکس برائے قواعد و موضوعات (حصہ دوم) 4

قواعد و موضوعات	حوالہ
ع	
1۔ اَحَدٌ میں جمع کا مفہوم	69/الحاقۃ:47،ترکیب
2۔ آخرت پر یقین کا اثر	83/المطففین:4،نوٹ۔3
3۔ آخرت کے مضامین میں تکرار کی وجہ	78/النبا:2،نوٹ۔2
4۔ استغفار کی برکات	71/نوح:10،نوٹ۔4
5۔استفہام کے مفاہیم	76/الدھر:1،نوٹ۔1
6۔اصحاب الاخدود کا قصہ	85/البروج:4،نوٹ۔2
7۔اصلاح کی کوشش کا ہدف	80/عبس:1،نوٹ۔1
8۔الہام فطری کی وضاحت	91/الشمس:8،نوٹ۔2
9۔ انسانی اختیارات اور مشیت الٰہی کا تعلق	76/الدھر:29،نوٹ۔3
10۔انگلیوں کے پور کی اہمیت	75/القیامۃ:4،نوٹ۔3
11۔اونٹ کی خصوصیت	88/الغاشیۃ:17،نوٹ۔2
12۔اہل کتاب اور مشرک کا فرق	97/القدر:1،نوٹ۔2
13۔ایک دن پچاس ہزار کے برابر ہونے کا مفہوم	70/المعارج:4،نوٹ۔1
ب	
1۔بت پرستی کی ابتداء	71/نوح:23،نوٹ۔2
ت	
1۔تائے تانیث اور بائے سکت کا فرق	69/الحاقۃ:19،نوٹ۔2 ترکیب
2۔تخلیق انسانی کا ماخذ اور مراحل	76/الدھر:2،نوٹ۔2
3۔ترتیل کا مطلب	73/المزمل:4،نوٹ۔1
4۔ تقدیر کی وضاحت	80/عبس:19،نوٹ۔3۔4

قواعد و موضوعات	حوالہ
ث	
1۔ثَمَّ کا استعمال	81/التکویر:21،نوٹ۔2
ج	
1۔جذباتی بلوغت کا حصول	70/المعارج:19،نوٹ۔2
2۔ جنتی کی سب سے بڑی نعمت	98/البینۃ:8،نوٹ۔2
3۔ جنات کی حقیقت	72/الجن:1،نوٹ۔1
4۔ جھاڑ پھونک کی شرعی حیثیت	113/الفلق:4،نوٹ۔3
ح	
1۔حکمت تبلیغ کی تعلیم	79/النزیات:18،نوٹ۔2
2۔حیات بعد الموت کی دلیل	84/الانشقاق:16،نوٹ۔1
خ	
1۔خشیت کا مفہوم	98/البینۃ:8،نوٹ۔3
د	
1۔دوزخی اور جنتی کی علامات	79/النزیات:31،نوٹ۔3
ر	
1۔راہ نجات کے تقاضے	103/العصر:3،نوٹ۔2
2۔رسول اللہ ﷺ پر جادو کا اثر ہونا	113/الفلق:4،نوٹ۔2
3۔ رسول اللہ ﷺ کے ضالاً ہونے کا مطلب	93/الضحیٰ:7،نوٹ۔7
س	
1۔سجدے میں دعا مانگنے کا مسئلہ	95/التین:19،نوٹ۔3

قواعد وموضوعات	حوالہ
2۔ سمندر میں آگ کیسے لگے گی	81 / التکویر:6، نوٹ۔4
3۔ سورۃ فیل کا تاریخی پس منظر	105 / الفیل:1، نوٹ۔1
4۔ سورۃ مزمل کے آخری رکوع کا زمانۂ نزول	73 / المزمل:20، نوٹ۔1
5۔ سورۃ ملک کی فضیلت	67 / الملک:1، نوٹ۔1
ص	
1۔ صحف ابراہیم وموسیٰ کی وضاحت	87 / الاعلیٰ:19، نوٹ۔5
ع	
1۔ عَذَابًا صَعَدًا کا مفہوم	72 / الجن:17، نوٹ۔3
2۔ علم الیقین اور عین الیقین کا فرق	102 / التکاثر:5، نوٹ۔2
3۔ عمر میں کمی بیشی ہونا	71 / نوح:4، نوٹ۔3
غ	
1۔ غلط کاروں کو ڈھیل دینے کی حکمت	86 / الطارق:17، نوٹ۔3
ف	
1۔ فرعون خدائی کا دعویدار نہیں تھا	79 / النزیات:24، نوٹ۔4
ق	
1۔ قتل اولاد اور فیملی پلاننگ	81 / التکویر:8، نوٹ۔5
2۔ قرب الٰہی کی منزلیں	76 / الدھر:21، نوٹ۔3
3۔ قریش کا تاریخی پس منظر	106 / قریش:1، نوٹ۔2
4۔ قیامت کی عقلی دلیل	68 / القلم:35، نوٹ۔1
ک	
1۔ کفار سے معاہدہ کی مشروط اجازت	109 / الکفرون:6، نوٹ۔3
گ	
1۔ گناہوں کی معافی کے ضابطے	71 / نوح:3، نوٹ۔2
م	
1۔ مال ودولت کے لیے متوازن رویہ	100 / العدیات:8، نوٹ۔2
2۔ مسلمان کے دوزخی ہونے کے اسباب	74 / المدثر:42، نوٹ۔1
3۔ مشرقوں اور مغربوں کا مطلب	70 / المعارج:40، نوٹ۔3
4۔ من اور ما کا استعمال	109 / الکفرون:3، نوٹ۔2
5۔ منکرین حدیث کی تردید	75 / القیامۃ:19، نوٹ۔3
6۔ موت وحیات کی حقیقت	67 / الملک:2، نوٹ۔2
7۔ موسیٰؑ کا مقصد بعثت	79 / النزیات:19، نوٹ۔3
8۔ میدان حشر میں حاضری کا نقشہ	78 / النبا:18، نوٹ۔1
ن	
1۔ ناقص وادی اور یایی کے الفاظ کی پہچان	91 / الشمس:6، ترکیب۔
2۔ نامۂ اعمال کی ریکارڈنگ	82 / الانفطار:10، نوٹ۔1
3۔ نذر ماننے کے احکام	76 / الدھر:7، نوٹ۔3
4۔ نظر بد کا علاج	68 / القلم:51، نوٹ۔4
5۔ نفس لوامہ کی وضاحت	75 / القیامۃ:2، نوٹ۔2
6۔ نفس مطمئنہ کی وضاحت	89 / الفجر:15، نوٹ۔1۔4